© rasailojaraid.com

خطوط شیخ محمد عبداللہ

خطوط ڈاکٹر سید محمود

خطوط مولانا محمد مسلم (سابق مدیر دعوت، دہلی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

CMS/Lud-27/80

سری نگر

نمبر

۵ اگست ۱۹۸۰ء

مکرم مفتی صاحب!

السلام علیکم!

آپ کا خط مورخہ ۱۴ جون ۱۹۸۰ء موصول ہوا۔ اس کے ساتھ اکیڈمی آف اجتہاد کا جو میمورنڈم تھا وہ میری نظر سے گزرا ہے جیسا کہ آپ نے خط میں خود بھی اعتراف کیا ہے، یہ معاملہ انتہائی نازک ہے اور اس کے ساتھ بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کی ذہنی و جذباتی وابستگی ہے۔ تاریخ اسلام اس بات کی شاہد ہے کہ اجتہاد کے نام پر کئی تحریکیں پیدا ہوئیں اور اس طرح کی بھی کوششیں بالآخر امت کی تفریق اور تقسیم پر جا کر ختم ہو گئیں۔ ظاہر ہے ایک ایسی امت جو پہلے ہی کئی فرقوں اور خانوں میں بٹی ہوئی ہے اور جس کی اجتماعی قوت کا شیرازہ صدیوں سے منتشر ہے، اس میں اجتہاد کی کوئی بھی نئی آواز مزید تفرقات پیدا کر سکتی ہے۔ ایسے ملکوں میں جہاں حکومت مسلمانوں کی اپنی ہے، وہاں اگر اس قسم کا کوئی خیال ابھرے تو حق بجانب ہوگا۔ لیکن ہمارے ملک میں جہاں کہ مسلمانوں کی اقلیت ... بہر جہت اقتصادی اور سماجی مسائل میں الجھی ہوئی ہے اور جسے اپنا حال اور مستقبل چاروں طرف سے ابر آلود دکھائی دیتا ہے، اس طرح کی کوشش کے منفی نتائج ہی برآمد ہوں گے۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان نئے نئے اختلافات سر ابھاریں گے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کی اجتماعی صلاحیت پر حرف آنے کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ میں کئی بار آپ کو لکھ چکا ہوں، اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ متحد ہو کر اپنے دینی و ملی مفادات کا تحفظ کریں اور اقتصادی و سماجی سطح پر ان کے ساتھ جو کچھ بھی نابرابری ہے اسے دور کرنے کے لئے حکومت سے رجوع کریں۔ اس کے لئے پُر امن طور پر جد و جہد کا راستہ اپنانا ہوگا اور ایسا کرتے وقت مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات کو پس پشت ڈال کر ایک اجتماعی سوچ کی آبیاری کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں ہمارے دانشور اور علماء بہت ہی بہتری خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اس وقت بدقسمتی سے حالات کی جو ناساعد صورت ہے اس کے لئے بڑی حد تک میں خود مسلمانوں کو ہی ذمہ دار سمجھتا ہوں کیوں کہ وہ اپنی اقتصادی و سماجی ابتری کا احساس کرنے کی بجائے ایسے الجھے مسائل میں الجھ جاتے ہیں جن کی افادیت بدلتے ہوئے حالات میں بہت ہی کم ہے۔ اسی نکتہ نظر سے میں اکیڈمی آف اجتہاد کے قیام کی سعی کو بھی دیکھتا ہوں۔ میمورنڈم میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا، لیکن یہ باتیں اس پُر آشوب دور میں ہندوستانی مسلمانوں کی کیا مدد کر سکیں گی، ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب شاید ہی مل سکے۔

مجھے امید ہے کہ میری ان معروضات کی سچائی کو آپ بخوبی محسوس کریں گے۔ زیادہ حد آداب!

آپ کا مخلص

شیخ محمد عبداللہ

(شیخ محمد عبداللہ)

جناب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی،
۲۳۱۴، اردو بازار، جامع مسجد،
دہلی ۱۱۰۰۰۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

CHIEF MINISTER
JAMMU AND KASHMIR

cms/Genl - 27/79

[illegible]
جموں (توی)
۶ جنوری ۱۹۷۹ء

محترم مفتی صاحب !

السلام علیکم !

آپ کا خط مورخہ ۱۱ دسمبر ۷۸ء موصول ہوا جس میں آپ نے اسلامک سنٹر کے قیام سے متعلق میری تجویز پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جب سے یہ تجویز ملت کے وسیع تر مفاد میں پیش کی تھی میری خواہش ہے کہ یہ سنٹر ایک ٹرسٹ کی صورت میں قائم ہو اور اس میں سبھی ریاستوں کو مسلم آبادی کے تناسب کے لحاظ سے نمائندگی ملے اس طرح یہ اسلامک سنٹر ملت کی اجتماعی فلاح کا مرکز بن جائے گا اور اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے ٹرسٹ کے لئے وسائل جمع کرتے وقت بھی ریاستوں میں یکساں کوشش ہونی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس نیک کام میں شریک ہو سکیں۔ اس سلسلے میں ہر ایک ریاست میں حسب استطاعت مالی وسائل جمع کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے مرحلے کے طور پر یہی کرنا ضروری ہوگا اور جب پورے وسائل کا اندازہ ہو جاتا ہے تو پھر دوسری باتوں کا تعین زیادہ آسانی سے ہو سکے گا۔

جہاں تک اولڈ بوائز سوسائٹی کے دفتر کا تعلق ہے یہ بھی سنٹر کی عمارت میں ہو سکتا ہے لیکن اس کا حتمی فیصلہ ٹرسٹ کو کرنا ہوگا۔ دراصل اس طرح کے سبھی امور ٹرسٹ کے قیام کے بعد اجتماعی فیصلے کی صورت میں طے ہوں گے۔

آپ نے شیر شاہی مسجد کی جو تجویز رکھی ہے وہ بھی نہایت مناسب ہے۔ مستقبل میں اس ادارے کے فروغ کے پیش نظر اس کے لئے زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کی جانی چاہیے۔ بہر حال آپ خود موقعہ پر موجود ہیں اور اس سلسلے میں بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص
شیخ محمد عبداللہ
(شیخ محمد عبداللہ)

جناب مفتی عتیق الرحمان عثمانی،
جامع مسجد،
دہلی ۱۱۰۰۰۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر سید محمود کا ایک بصیرت افروز مکتوب

....

مرحوم ڈاکٹر سید محمود اپنی ممتاز علمی شخصیت رکھنے کے ساتھ تحریک آزادیٔ ہند کے صف اول کے رہنماؤں میں سے تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ برسوں نہرو، خان عبدالغفار خاں، پٹیل، کرپلانی اور مولانا آزاد وغیرہ کے ساتھ کانگریس ہائی کمانڈ کے رکن رہے۔ آزادی کے بعد کئی سال تک نہرو وزارت میں وہ وزیر خارجہ بھی رہے اور پارلیمنٹ کے بزرگ ممبر بھی۔ وسط ہند میں کٹنی، جبلپور، ساگر وغیرہ کے ہولناک فسادات کے بعد ۱۹۶۱ء میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے جب پہلا کل ہند مسلم کنونشن نئی دہلی میں بلایا تھا (جس پر پنڈت نہرو بھی تلملا کر رہ گئے تھے) اُس کی صدارت ڈاکٹر سید محمود ہی نے فرمائی تھی۔

مسلم مجلس مشاورت کی تاسیس اور اُس کی صحت مند رہنمائی میں ڈاکٹر صاحب کی دل سوزیوں کا بڑا دخل تھا۔ مجلس کے پہلے صدر بھی وہی تھے۔ چند برسوں کے بعد اپنی صحت اور حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے مجلس سے یکسوئی اختیار کر لی تھی۔ اور مفتی صاحب کو مجلس کی ذمہ داری سپرد کرتے ہوئے اپنے دل کی واردات ایک طویل خط میں تحریر فرمائی تھی جو ذیل میں شریک اشاعت کیا جارہا ہے۔ یہ خط بڑی درد انگیز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سبق آموز حقیقتوں کا ایک یادگار مرقعہ ہے ـــــ انیس الحسن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی جناب مفتی صاحب! السلام علیکم

آج آپ کا گشتی خط ملا کہ آپ مرکزی مجلس مشاورت کا ایک ہنگامی جلسہ لکھنؤ میں ۲۰/۲۱/ اپریل کو کرنا چاہتے ہیں اور مجھے مدعو کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مارچ ۱۹۶۷ء سے یعنی گزشتہ الکشن کے فوراً بعد میں نے مجلس مشاورت کے کاموں سے بالکل دلچسپی لینا چھوڑ دیا اور آپ کو کاموں کا پورا چارج دیدیا اس وقت سے جو کچھ مجھ سے ہو سکا آپ کا ذکر کرتے رہے۔ میں نے کئی بار استعفا بھی پیش کرنا چاہا، لیکن آپ اور مولانا سید علی میاں صاحب اور حضرت مولانا ابو اللیث صاحب نہایت اصرار کے ساتھ مانع آتے رہے۔ آپ حضرات کا اصرار شدید تھا۔ آپ لوگ سمجھتے تھے کہ استعفا شائع کرنے سے ملت میں اختلاف برپا ہوگا اور شاید گروہ بندیاں ہو جائیں گی، میں عملاً تو مجلس کے کاموں سے ایک سال سے علیحدہ رہا۔ لیکن پبلک میں اپنا استعفا مجلس کی صدارت سے پیش نہ کیا۔ چاہے یہ بھی میرا قصور تصور ہو۔ مجھے اس کے ماننے میں کوئی عذر نہیں، آپ بزرگانِ وقت ٹالتے رہے کہ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں۔ چوں کہ آپ صاحبان کی بزرگی، فضیلت و علمیت اور قومی درد کا مجھے پورا احترام تھا اور ہے، اس لئے میں آپ حضرات سے فرمانے کی تعمیل کرتا رہا اور آپ کے اس اصرار کو ملت کی بھلائی کا باعث سمجھ کر تعمیل کرتا رہا، چاہے اس تعمیل سے مجھے اذیت ہی کیوں نہ پہنچی ہو۔ اس کے بعد آپ صاحبان کئی مختلف قسم کی تجویزیں بھی پیش کرتے رہے مگر وہ تجویزیں صرف گفتگو تک محدود رہیں، کبھی عملی جامہ نہ پہنا۔ اب میں مجلس مشاورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی صدارت سے ادب اور دلی افسوس کے ساتھ استعفا پیش کرتا ہوں۔ اس کے وجوہ کا آپ حضرات کو پورا پورا علم ہے۔ یہ ایک طولانی قصہ ہے، مختصر یہ کہ ہم الیکشن کا شکار ہو گئے۔ لکھنؤ میں جس بلند و اخلاقی عزم و ارادہ کو لے کر اٹھے اور جو وعدے ملک و قوم سے کیے تھے اور جس کا عملی جامہ پہنانے کے لیے نقشہ بنا، دو برس تک ملک کا دورہ کرتے رہے، اس خواب کی تعبیر کا وقت اب آیا تھا، مگر افسوس الیکشن کا وقتی جوش اس بلند اخلاقی و تعمیری کام کے جوش پر غالب آ گیا۔

ہمارا آخری دورہ جس شان کا ہوا اور وہاں کے ہندو مسلمانوں نے جس جوش و خروش اور ہم آہنگی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہم کو معزز ہندو صاحبان نے "ملک کا آئندہ ثالث" کہہ کر اس کام پر مبارک باد دی۔ مگر آپ جانتے ہیں ہمارا وہ دورہ، الیکشن کا دورہ تھا گو اس سے ہم شروع میں لاعلم تھے۔ دوسری جگہ کانگریس دشمنی یا نفرت کا جذبہ اس وقت غالب آ گیا اور اس حد تک غالب آ گیا کہ مرکزی مشاورت کے لاجواب اور اخلاقی حیثیت سے بلند رزولیوشن کی مخالفت ہوئی جو الیکشن کے بارے میں تھا۔ بعض مشہور انگریزی اخبارات نے مرکزی رزولیوشن کے متعلق UNEXCEPTIONABLE کہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تک کسی مسلم یا کسی سیاسی پارٹی نے ایسا رزولیوشن الیکشن کے بارے میں پاس نہ کیا تھا۔ اس رزولیوشن کی عملی مخالفت نے مجلس مشاورت کے اعلیٰ و بلند اخلاقی کردار کو ختم کر دیا، اور مجلس مشاورت بھی ایک معمولی الیکشن کی پارٹی بن کر رہ گئی۔

مرکزی مجلس مشاورت کا عوامی منشور ایک بلند پایہ اخلاقی و سیاسی میل ملاپ کی دستاویز تھا جس میں بعد میں ایسے اضافے ہو گئے جو چاہے کتنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی صحیح رہے ہوں لیکن قوم کو اور مجلس کو ہماری بلند اور اونچی سطح سے نیچے پہنچا گئے۔ اس منشور کے متعلق کلکتہ یونیورسٹی کے تاریخ کے ایک پروفیسر نے کہا تھا کہ ہندوستان میں پہلی بار کسی مسلم جماعت نے ایسا منشور پیش کیا وغیرہ وغیرہ۔ عوامی منشور اور مرکزی مجلس کے رزولیوشن سے متعلق تعریفیں اور تنقیدیں تو ہم الیکشن کے بعد میں سنتے اور پڑھتے پھر دیکھتے کہ مشاورت کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔

دوسری طرف مجلس مشاورت اس بلند اخلاقی ارادے اور کردار کے باوجود ایک فرقہ پرست جماعت تھی ایسا الزام دینے میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ اگر ہم مجلس کے منشور کی منشا اور مرکزی رزولیوشن پر عمل کرتے تو یہ الزام بڑی حد تک دور ہو جاتا۔ مجھے اس پر اس قدر یقین تھا کہ وقت آنے پر مطلع صاف ہو جائے گا اور الزام کا بادل خود بخود چھٹ جائے گا۔ پنڈت سندر لال کا تو کیا ذکر، وہ تو ہمارے ایک معزز رفیق و مبلغ تھے ہی، لیکن پارلیمنٹ کے جو ہندو حضرات بھی ہمارے ساتھ دورہ میں گئے وہ ہمارے مبلغ ہو گئے انھوں نے مجلس مشاورت کو تائید غیبی بتایا۔ زیادہ تعداد میں مختلف مجبوریوں کے باعث ہم اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تھے۔ مگر الیکشن کے بعد یہ آسان ہو جاتا۔ اگر عوامی منشور سے پُر اثر اور میل ملاپ کی ضرورت کے بہترین پیراگراف نکالے نہ گئے ہوتے تو منشور ملک میں بہت چمکتا۔

خلافت کی تحریک میں قربانیاں مسلمانوں نے پیش کیں، اس کے باعث مسلمان ملک پر اور کانگریس پر چھا گئے تھے۔ ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ ملک کی آزادی شاید تنہا مسلمان ہی حاصل کر لیں گے۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک کو چورا چوری کے باعث واپس لے لیا اس وقت بہت لوگوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دلوں میں شبہات پیدا ہوئے ، مجلس مشاورت کے بانیان دوبارہ انھیں لائینوں پر مسلمانوں کو لے جانا چاہتے تھے۔

ملک کی تقسیم کو نہ صرف کانگریس ، بلکہ ہندو مہاسبھا و دیگر پارٹیوں نے بھی منظور کر لیا تھا۔ کانگریس نے سب سے پہلے دریافت کیا تھا اور سب سے پہلے تقسیم کو منظور کرنے کی تائید کی۔ یہ بات پنڈت جواہر لال نے اپنی ایک تقریر میں بھی کہی تھی۔ جب کہ اب صرف کانگریس پر الزام لگایا جاتا ہے۔ حالاں کہ سب سے پہلے دریافت کر لیا گیا تھا۔ اس تقریر کا خلاصہ ابھی حال ہی میں ندائے ملت نے اپنے صفحہ اول پر شائع کیا ہے۔

گاندھی جی نے اور مولانا آزاد نے اس کے خلاف کوشش کی مگر ناکامیابی ہونے پر اپنے دوستوں پر چھوڑ دیا۔ اُن کی آنکھوں نے تقسیم کے جو نقصانات دیکھے تھے وہ سب ہمارے سامنے ہے۔ ابھی معلوم نہیں آئندہ ملک کو کیا کیا نقصانات برداشت کرنے ہوں گے۔ آج کی ساری خرابیاں تقسیم کے باعث پیدا ہوئی ہیں پھر سے مسلمانوں کو ایک گروہ کی طرف سے ملک بدر کرنے کی کوشش شروع ہے۔ یہ ممکن تو نہیں ہے لیکن کہیں اگر ایسا ہو جائے تو اکثریت کے اپنے بھائیوں کو پتہ چل جائے گا کہ مسلمان ملک کا کتنا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یک جہتی کے لیے مسلمان ایک بڑا عنصر ہے اور مسلمان کے بغیر ملک کا بام ترقی پر پہنچنا مشکل ہے۔ شری ڈاکٹر بھٹناگر نے بڑی خوبی سے اس مطلب کو یوں ادا کیا ہے۔

مزہ تو جب ہے کہ ہندو کہے مسلمان سے
بغیر آپ کے ہندوستان کیا معنی

لفظ ’کیا معنی‘ نے اپنے سارے یقین و جذبات نیز ہند کی تاریخ کو کہہ دیا ہے۔ ’ہند چھوڑو‘ کے مصنف نے یہ کہا ہے کہ آزادی وقت سے پہلے آئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

'ہندوستان چھوڑو' پر دوبارہ غور کر رہے تھے کہ کیا یہ نعرہ و تحریک خلافت صرف اسلامی خلافت کے احیا کے لیے نہ تھے بلکہ ملک کی آزادی اور بہت بڑے پیمانے پر ملکی یک جہتی کے لیے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں موپلاؤں نے جو قربانیاں دیں وہ ملک کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی قربانیوں کا اہم جزو ہیں، جس کے باعث بہادر موپلا قوم تباہ و برباد کر دی گئی۔ پھر ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی میں سرحد کے پٹھانوں نے جو قربانیاں دیں وہ بھی ملک کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی قربانی کا بڑا نمایاں پہلو ہے۔ خلافت کی بلند پایہ تحریک کو، بعض بڑے لیڈروں کی مدد سے موپلا کا بہانہ بنا کر ختم کر دیا اور ملک میں پھر سے فتنہ و فساد برپا ہو گیا۔ اس وقت گاندھی جی و دیگر بڑے بڑے لیڈران جیل میں تھے۔ جب جیل سے نکلے تو تحریک فرقہ وارانہ فساد کی نذر ہو چکی تھی۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی وغیرہم نے پانچ چھ برس تک میل ملاپ کی تحریک کو گاندھی جی کی مدد سے پروان چڑھایا جس کو آئندہ کا مورخ ضرور سراہے گا۔

گاندھی جی نے تقسیم کے بعد ایک موقعہ پر کہا تھا کہ اگر صحیح معنوں میں ہندو مسلم مفاہمت نہ ہو تو ملک و ہندو دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ میں نے سوال کیا "کیا اب بھی؟" جواب ملا کہ "اب بھی!" اس وقت میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور یہ سمجھا کہ چوں کہ یہ بات اُن کے دل کو لگی ہوئی ہے اس لیے ایسا کہتے ہیں مگر بعد کے واقعات نے بتلایا کہ اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح ہے۔ ان کی رائے کے خلاف تقسیم کو مان کر اور خوشی سے منظور کر کے اس کا نتیجہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

اسی طرح مسلمانوں کی موجودہ بلاوجہ مارکاٹ ملک کو شدید نقصان پہنچا رہی ہے۔ جسم کے ایک جزو لاینفک کو بے کار کیا جا رہا ہے۔ مسلمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بحیثیت دست کار کے ملک کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ اگر آج وہ امتحان مقابلہ پاس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے لیکن ایڈمنسٹریشن میں کارنمایاں دکھلا سکتے ہیں جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔ آج ہم جس طرح تقسیم کا نتیجہ بھگت رہے ہیں اُسی طرح کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کی مارکاٹ کا نتیجہ ہمارے سامنے آئے گا۔ جمشید پور وراوڑ کیلا کے واقعات کے بعد مجھے اور آپ سب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ نافہم اکثریت نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ملک کو برباد کر رہی ہے۔ اس خیال کو لے کر ہم نے لکھنؤ میں وہ بلند پایہ عزم وارادہ کیا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود اس حالت کو ہم خاموشی سے نہیں دیکھ سکتے۔ اب ہم کو خود میدان میں آنا چاہیے اور باہمی یک جہتی ملک میں بپا کرنے کے لیے اپنی جان تک لڑا دینا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم کو اور آپ کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندو کثیر تعداد میں بہت اچھے ہیں وہ بلوہ و فساد نہیں چاہتے مگر وہ خاموش ہیں یا تو ان کو ہماری طرف سے کچھ شبہ ہے یا وہ لڑنے والے گروہ سے ڈرتے ہیں اور مقابلہ کی ہمت نہیں رکھتے۔ یک جہتی کی تحریک جسے خلافت کی تحریک نے ادھورا چھوڑا تھا، اس کو ہم نے نئے سرے سے جگایا اور پورا کرنے کے ابتدائی دور میں تھے کہ الیکشن کے جوش نے ہم کو آدبوچا اور ہم اس کے شکار ہو گئے۔

خبر گرم ہے کہ سیاسی تحریک شروع ہو گی اور تنظیمی تحریک بھی جاری رہے ہر نا کامیابی کے بعد پہلے بھی مسلمانوں نے تنظیمی تحریک شروع کی چنانچہ خلافت کے بعد بھی تنظیمی تحریک بڑے زور شور سے ڈاکٹر سیف الدین کچلو جیسے بلند پایہ لیڈر نے شروع کی مگر وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوئی۔ سیاسی تحریک یعنی کونسلوں کے ذریعے کام کرنے کی کوشش تو آپ کو یاد ہو گا۔ ۲۱ءکی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ناکامیابی کے بعد کانگریس میں اس مسئلہ میں شدید اختلاف پیدا ہوا اور دو گروہ بن گئے۔ چینجز اور نو چینجرز، ایک سال کی لڑائی کے بعد گاندھی جی کے گروہ نے کانگریس کو کونسل کے حامیوں کے حوالہ کر دیا کہ اچھا آزمالو۔ سنہ ۲۲ء سے سنہ ۲۹ء تک کونسل کا طریقہ آزمایا گیا اور ناکامیابی کے بعد سب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کونسل کے طریقہ کار کو چھوڑ دیا اور لاہور میں خودمختاری حاصل کرنے کا عدم تعاون کے ذریعہ اعلان کر دیا۔ اس وقت تو جداگانہ انتخاب تھا۔ ایک خیال کے مسلمان منتخب ہو سکتے تھے۔ اب مخلوط انتخاب کا ذریعہ ہے۔ اس طریقے میں ممکن نہیں کہ سارے مسلمان صرف ایک مسلمان کے گروہ کا ساتھ دیں اور ایک ہی خیال کے مسلمان منتخب ہوں۔

اقلیت کے لیے ایک مذہبی سیاسی پارٹی مضر ثابت ہو گی۔ سابق مسلم لیگ کی کامیابی جداگانہ انتخاب کے باعث تھی۔ اکثریت کے اُس گروہ کو جو ہمارے خلاف ہے، اکثریت کو ہمارے خلاف ابھارنے کا موقعہ ملے گا۔ جنوب میں جو تھوڑی بہت کامیابی ہے وہ کیرالا کے باعث ہے، اس سے ہم غلط فہمی میں نہ پڑیں۔

مرکزی مشاورت کے رزولیوشن کی تائید اور حفاظت کرنا میرا فرض تھا، جس کو میں نے پورا کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے اپنے بعض ساتھیوں سے اختلاف پر اخبار میں بیان دیا مگر بدقسمتی سے وہ بیان انگریزی اخبارات تک محدود رہا۔ شاید اردو اخبارات میں نہ آیا۔

اس بیان میں میں نے خوف ظاہر کیا تھا اور ایک طرح پر پیش گوئی کی تھی کہ "کنگ لاگ" کو ہٹا کر "کنگ شارک" کو لا بٹھانا مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچائے گا۔ چنانچہ ویسا ہی ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کردار کو ختم کرنے کا الزام کس پر ہے اور اب کیا کرنا ہے ؟

اول الذکر سوال کا جواب مختصر یہ ہے کہ سب میرا قصور ہے۔ مجھ میں یہ طاقت واہلیت نہ تھی کہ میں اپنے اُن ساتھیوں کو ان کے کرنے سے باز رکھتا مگر میں نہ کرسکا۔ اس لیے میں ہی موردِ الزام ہوں۔ ایسی حالت میں مجھے صدارت سے علیحدہ ہوجانا چاہیے۔

اب رہا دوسرا سوال، اس کے جواب سے معذور ہوں۔

آخر میں آپ اور مولانا ابواللیث صاحب کا تہ دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ آپ دونوں نے ہمیشہ میرے خیالات کا ساتھ دیا۔

علی میاں صاحب کی فضیلت وعلمیت و خطابت کا میرے دل میں بڑا احترام ہے۔ اس کے علاوہ ان کے جد حضرت سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بریلوی میرے خاندانی پیر تھے۔

مولانا منظور صاحب بھی اول دن سے شریک کار رہے اور بانیوں میں تھے مگر ۱۳؍ دسمبر کے بعد سے میری ان کی گفتگو زیادہ تر پرائیویٹ تھی اس لیے اس کا ذکر کرنا نامناسب ہے۔

جناب مسلم صاحب بھی اول دن سے ساتھ تھے اور بانیوں میں سے تھے ان کا بھی تہ دل سے مشکور ہوں کہ ان سے ہر طرح کی مدد اور مشورے ملتے رہے

جن بعض بھائیوں سے میرا اختلاف ہوا اُن سے بھی مجھے کوئی ذاتی شکایت نہیں ہے اُن کی ایمانداری میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں وسعت پیدا کریں۔

(ڈاکٹر) سید محمود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انبالہ جیل سے

ایک شریف النفس صحافی کے دو خط

پادش بانَدوہ، ایمرجنسی کے زمانہ میں روزنامہ دعوت دہلی کے سابق ایڈیٹر اور اُردو کے ممتاز صحیفہ نگار مرحوم محمد مسلم صاحب نے اپنی نظربندی کی حالت میں انبالہ جیل سے حضرت مفتی صاحب کو دو خط لکھے تھے یہ خطوط اگرچہ ذاتی نوعیت کے تھے لیکن وہ مرحوم محمد مسلم صاحب کی عالی ظرفی اور تعمیری اندازِ فکر کے آئینہ دار ہیں اور اس دور کی تلخ کامیوں کی یادگار۔ مفتی صاحبؒ سے اُن کو قلبی تعلق تھا اور اسی داعیہ کے پس منظر میں یہ خطوط لکھے گئے تھے جو ہم شریکِ اشاعت کر رہے ہیں۔

مرتب

سنٹرل جیل، انبالہ

معظمی و گرامی مفتی صاحب! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عرصے سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہو سکی، میں بھی شروع اپریل میں دہلی سے یہاں آ گیا تھا جس کے بعد دلی نہیں جانا ہوا۔ اس عرصے میں صدیقی صاحب اور فارقلیط صاحب کے دو سانحے ایسے گزرے جن کا اثر عرصے تک دل پر رہے گا، ایسے صاحبِ بصیرت جری متحرک اور دیانت دار صاحبِ بیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے یہاں انگلیوں ہی پر گنے جا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور ابرار و صلحا کی صف میں شامل کرے، میں یوں تو راضی برضا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ یقیناً اس موجودہ افتاد میں ضرور بالضرور خدا کی کوئی ایسی مصلحت ہو گی جسے فی الوقت ہم نہیں سمجھ سکتے پھر بھی بسا اوقات یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایسے لوگ جو سرتاپا قانون کے پابند ہوں اور جن کا مطلوب یہ رہا ہو کہ تعمیر و اصلاح کی جانب لوگ مائل ہوں، شورش انگیزی ختم ہو انھیں قید و بند میں ڈال کر کیا فائدہ اٹھایا گیا ہے، اگر یہ محض توازن کے لیے ہے تو چاہے اسے وسیع تر مصلحت کی خاطر گوارا کر لیا جائے مگر انصاف پسندی اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، میری خواہش تو یہ تھی کہ ہمارے دستور پالیسی اور سارکردگی سب کا جائزہ لے کر کوئی یہ انگلی تو رکھتا کہ تم نے یہاں غلطی کی ہے، انسان سے غلطی تو ممکن ہے مگر اسے معلوم تو ہونا چاہیئے کہ اس نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ مرکز میں بہر حال ایسے معقول لوگ ہیں جو اس سلسلے میں مطمئن ہو بھی سکتے ہیں اور کر بھی سکتے ہیں، دستور کی تحریریں بھی بہر حال وحی الٰہی تو نہیں کہ جن میں رد و بدل نہ کیا جا سکے۔ میں خیال کرتا تھا کہ صدیقی صاحب یہ کام کر سکیں گے مگر اللہ تعالیٰ انھیں اب آرام دینا چاہتا تھا اس لیے وہ بھی ہم میں سے اٹھ گئے اور یہ تو خیر ایک چھوٹا سا مقصد تھا بڑا مقصد تو یہ تھا کہ ہم بحیثیت ملت کے یہ سوچتے اور کچھ کوشش کرتے کہ حالات کو معمول پر لایا جائے اور صف آرائی کی جگہ مذاکرات کا آغاز ہو۔ غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے کسی کو بھی معصوم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایک سال پہلے واقعی لوگوں نے انتشار اور افراتفری کا ماحول پیدا کر دیا تھا لیکن اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ حالات کو درست کیا جائے اور ہم اس میں کوئی تعمیری رول ادا کریں۔ بعض سمجھ دار لوگوں کے بارے میں خیال تھا کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالات کو سدھارنے میں مددگار ہوں گے مگر ان کا مبلغ فکر سطحی باتوں سے آگے پہنچتا ہی نہیں ایسے ہی ایک صاحب شاید اب گائے کا سوال چھیڑے ہوتے ہیں جس سے سوائے مذہبی جذبات اُبھارنے کے اور کوئی کام نہیں ہوگا، وہ توازن و اعتدال جو ایک صحت مند معاشرے کے لیے لازمی ہے بدقسمتی سے اس سے کوئی بھی بہرہ ور نہیں ہے کچھ کام اگر کر سکتی تھی تو لیس ملت سے امید تھی مگر اسے اس کا موقع ہی نہیں ملنے پا رہا ہے۔ یہاں انبالہ آکر بچوں کے لیے ملنا خاصا دشوار ہے اور مہنگا بھی، پھر بھی مہینے میں ایک بار اور کبھی دو بار کوئی چکر لگا ہی جاتا ہے گھر سے خطوط بھی آتے رہتے ہیں جن سے خیریت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ یہ رجب کا مہینہ ہے بڑا جی چاہتا ہے کہ کچھ اور نہ ہو تو رمضان تک دلی ہی میں منتقل ہو جائیں، حالاں کہ صحیح بات شاید یہ ہے کہ یہاں رہنے میں ہم زیادہ اجر کے مستحق ہوں گے، یہاں ہم لوگوں کی صحت الحمدللہ اچھی ہے، امید ہے کہ آپ بھابی صاحبہ اور سب لوگ اچھی طرح ہوں گے۔ خاں صاحب سلام کہتے ہیں۔ والسلام

محمد مسلم نظر بند سنٹرل جیل، انبالہ

سنٹرل جیل، انبالہ

گرامی و معظمی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

صدیقی صاحب (مرحوم محمد یوسف صدیقی ایڈیٹر ریڈیئنس ویکلی دہلی) کے انتقال نے ایک بڑا خلا پیدا کر دیا ہے اور کہنے کو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ خلا آسانی سے پُر ہونے والا نہیں لیکن اسے پُر کرنا ضروری ہے کہ وہ ملی اجتماعیت کی علامت ہے اور اس ضمن میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے میرا خیال ہے کہ شیخ عبداللہ صاحب وغیرہ سے مشورہ کر کے مشاورت کی عاملہ کی نشست بلانے کی ضرورت ہے جس میں موجودہ حالات پر غور کر کے یہ فیصلہ ضروری ہے کہ کن دائروں میں تعاون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا جا سکتا ہے اور اس کی کیا شکلیں ہو سکتی ہیں اسی طرح ملکی اجتماعیت میں جو جمود پیدا ہو چکا ہے اور صف آرائی کی شکل اب تک پائی جا رہی ہے اسے تعمیر کی طرف کس طرح موڑا جائے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ بھی کافی اہمیت رکھتا ہے جس میں جذبات سے بالاتر ہو کر توازن کے ساتھ رائے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مؤخرالذکر معاملے کا فیصلہ ایک دن میں ہونا تو مشکل ہے۔ البتہ اس کے لیے سوالنامہ جاری کیا جا سکتا ہے تاکہ اس پر اطمینان بخش طور پر جو سب کو مطمئن کرنے والا ہو اور عقلی و نقلی دلائل پر مبنی ہو کوئی واضح بات سب کے سامنے آسکے ویسے تو اس مسئلے کا حق تھا کہ اس پر دنیا بھر کے علما غور کر کے کوئی رائے قائم کرتے کیوں کہ یہ مسئلہ صرف یہیں کا نہیں بلکہ ساری دنیا میں پیش آرہا ہے، میں کل ہی اپنے ملک کی ایک اقتصادی رپورٹ پڑھ رہا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں تقریباً ۱۲، ۱۴ کروڑ ایکڑ قابل کاشت زمین بے کار پڑی ہے اسی طرح سمندروں اور دریاؤں اور تالابوں سے مچھلی اور پہاڑوں و ریگستانوں میں گائے بکری کی کئی گنا زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہمارے یہاں فی کلومیٹر ۱۷۶ افراد آباد ہیں اگر بڑے شہروں کو چھوڑ دیا جائے تو یہ تناسب ۵۰، ۶۰ افراد فی کلومیٹر رہ جاتا ہے ایک حوصلہ مند قوم ان مسائل پر غور کرے تو وہ ملکی پیداوار میں بہت کافی اضافہ کرنے کی باتیں سوچ سکتی ہے البتہ اس کے لیے افراد کو سخت جد وجہد کرنی ہوگی، دوسری طرف ریاست کی مشکلات بھی لائق توجہ ہیں اور وہ بھی نیک نیتی کے ساتھ اپنی کچھ ذمہ داریاں سمجھ رہی ہے اس لیے ان پر بھی غور کرنا ہوگا اور کوئی عملی فارمولا سوچنا ہوگا۔ آپ پر کاموں کا جو بوجھ ہے وہ یقیناً بہت زیادہ ہے اس لیے صدیقی صاحب کی جگہ کو سردست نہ پُر کیا جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو بھی دفتری کاموں کے لیے کسی کو نامزد کرنا مفید ہی ہوگا، صغیر صاحب اس کے لیے موزوں ہوتے مگران کا دستیاب ہونا آسان نہیں، رضوی صاحب کو سوچا جا سکتا ہے بہر حال افراد کوئی بھی ہوں ضرورت حرکت و عمل کی ہے۔ عابدی صاحب پر بھی غور کیا جا سکتا ہے انھیں سفر کی بھی سہولتیں حاصل ہیں۔

میں بحمدہ اچھا ہوں، معلوم ہوا ہے کہ فیملی الاؤنس کی رٹ کی آئندہ جولائی میں سماعت ہوگی۔ "کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک" اس پر مستزاد یہ ہے کہ دلی والوں کو گھروں سے اتنا دور پھینک دیا ہے کہ یہ بھی ایک طرح سے سزا ہی ہو گئی ہے، بچے اگر مہینے میں ایک بار آنے کی کوشش بھی کریں تو خیال گزرتا ہے کہ ملاقات کی بجائے یہ رقم گھر کی ضروریات پر ہی صرف کی جاتی، خیر این ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر، بچے الحمد للہ سب ہی کامیاب ہو گئے اور سب سے زیادہ قابل قدر اسلم ہیں کہ دوسری مشکلات اور کئی ماہ کی مسلسل علالت کے باوجود انھوں نے ایم اے میں کامیابی حاصل کر لی اگرچہ ڈویژن سیکنڈ آیا ہے مگر اتنی ساری مشکلات کے باوجود ایک نئے مضمون میں یہ کامیابی غیر معمولی ہے۔ میں نے تو مجبوراً یہ سوچا تھا کہ وہ باہر چلے جائیں اور وہیں قسمت آزمائی کریں مگر پاسپورٹ کی دقت اور کچھ اپنے ملک میں رہ کر کام کرنے کے جذبے کی وجہ سے انھوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ آپ مشورہ دیجیے کہ کیا کشمیر وغیرہ کے محکمۂ تعلیم میں یہ کھپ سکتے ہیں یا علی گڑھ میں، یہاں گرمی کا اصل موسم ابھی ۴، ۵ دن سے شروع ہوا ہے اور لوہ چلنے لگی ہے تاہم رات آرام سے گزرتی ہے، کمر کا درد جو شاید کسی پرانے جھٹکے کی وجہ سے ہے قائم ہے اب دوا کی بجائے آسن کر رہا ہوں دیکھنا ہے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے، آپ کے پاؤں کے درد کا کیا حال ہے۔

محمد مسلم نظر بند سنٹرل جیل، انبالہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چوتھا حصّہ

سیاسی، علمی، دینی اور صحافتی شخصیتوں کے تاثرات اور پیغامات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا انیس الحسن ہاشمی	تعارف
مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند	تجویز
مسلم پرسنل لا بورڈ	//
جامعہ حسینیہ راندیر	//
دارالعلوم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ	//
"ترجمان" اہل حدیث	اداریہ
کل ہند مسلم مجلس مشاورت	تجویز
"ہماری زبان" دہلی	اداریہ
"مستقبل" بمبئی	//
"دین دنیا" دہلی	//
نائب صدر، ہدایت اللہ	پیغام
وزیر اعظم اندرا گاندھی ـــ الحاج ذوالفقار اللہ	
ہیم وتی نندن بہوگنا ـــ ابراہیم سیٹھ	

پیغامات

عقیل محمد میرٹھی	مکتوب
"الفرقان"	اداریہ
ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ	//
مولانا بدر الحسن قاسمی	//
ماہنامہ "طیب" دیوبند	//
"مسلم انڈیا" دہلی	
شیام لال یادو	پیغام
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	مضامین
مولانا محمد سعید مسعودی ۔ مولانا نسیم احمد فریدی	پیغامات
میر واعظ مولانا محمد فاروق ۔ عبدالرحمٰن کوندو	پیغامات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مے بھی ہے، میکش بھی ہیں، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
جی یہ چاہتا ہے لگا دیں آگ میخانہ کو ہم

●●●●●●●●●●●●●●●●●

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی وفات نے "موتُ العالِم موتُ العالَم" کا پورا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی وفات ایک فردِ واحد کی موت و وفات نہ تھی بلکہ اسلاف اور ان کی روایات کے ایک پورے عہد کا خاتمہ تھا علوم نبوت و انوار وحی الٰہی کی ایک شمع فروزاں تھی جو یکایک بجھ گئی۔ محاسن اخلاق و کردار کا ایک مینار تھا جو منہدم ہو گیا۔ خدمت خلق اور دردمندی عام و خاص کی ایک انجمن تھی جو ویران ہو گئی۔ ان کو بجا طور پر "خاتم الطائفہ" کہا گیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلاء کلمۃ اللہ اور علم و تقار کی جو محفلیں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حافظ امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھوں آباد ہوئی تھیں، مفتی عتیق الرحمٰنؒ ان کی آخری بہار تھے اور ان کی وفات نے پوری ملت کو ایک دریائے محرومی اور سوز غم کے آغوش دیدیا جعل اللہ الجنۃ مثواہ وانا للہ وانا الیہ راجعون۔

چنانچہ اس حادثہ جانکاہ کی کسک ہندوستان بھر کے دینی اور علمی اداروں، مدرسوں۔ تعلیم گاہوں۔ دانش کدوں۔ اسکولوں۔ کالجوں۔ سیاسی و سماجی حلقوں میں دُور دُور تک محسوس کی گئی۔ اس کا اندازہ ان بے شمار تعزیتی خطوط۔ برقیوں۔ بیانات اور جہاں تہاں ہونے والے جلسوں اور ان کی قراردادوں سے ہوتا ہے۔ جن میں سے کچھ آنے والے صفحات میں آپ کی نظر سے گزریں گے۔ اسی طرح برصغیر ہندو پاکستان میں پھیلے ہوئے اردو۔ انگلش ہندی اخبارات کی رپورٹوں اور اداریتی شذرات میں بھی اسی درد و غم کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے جو مفتی صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی وفات پر لکھے گئے۔

ان اخبارات وجرائد میں خاص طور پر قابلِ ذکر یہ ہیں

روزنامہ	مشرقی آواز	دہلی
"	انقلاب	بمبئی
"	عوام	دہلی
"	ہندوستان ٹائمز	دہلی
"	جنگ	کراچی
"	حریت	"
"	نوائے وقت	"
"	عزائم	لکھنؤ
"	آزاد ہند	کلکتہ
"	قومی آواز	لکھنؤ
سہ روزہ	دعوت	دہلی
ہفت روزہ	دیوبند ٹائمز	دیوبند
"	اخبار نو	دہلی
"	ریڈینس	دہلی

ہفت روزہ	نئی دنیا	دہلی
"	ترجمان اہلحدیث	"
"	نقیب	پھلواری شریف
"	نوائے اسلام	دہلی "
"	دین دنیا	"
ماہنامہ	الفرقان	لکھنؤ
"	معارف	اعظم گڈھ
"	مسلم انڈیا	دہلی
"	طیب	دیوبند
"	مستقبل	بمبئی
"	الثقافۃ الاسلامیہ (عربی)	دیوبند
پندرہ روزہ		
	گلشن	مالی گاؤں
	ہماری زبان	علی گڈھ

ان میں سے چیدہ چیدہ جرائد کے شذرات اور آرٹیکل آنے والے صفحات میں پیش خدمت کئے جا رہے ہیں۔

تعزیتی پیغامات بھیجنے والوں میں الحاج جنرل ضیاء الحق صدر مملکت پاکستان
الشیخ عبداللہ النصیف امین عام رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی

مسٹر ہدایت اللہ سابق چیف جسٹس آف انڈیا

بیگم شیخ عبداللہ (مرحوم) سابق وزیر اعظم کشمیر

خطیب کشمیر میر واعظ مولانا محمد فاروق (سری نگر)

سربراہ جماعت بواہر سیدنا ملا برہان الدین (بمبئی)

ڈاکٹر شہزادہ یوسف نجم الدین (بمبئی)

ڈاکٹر فاروق عبداللہ وزیر اعظم کشمیر

الحاج محمد عثمان عارف (گورنر اتر پردیش (لکھنؤ)

الحاج عبدالستار یوسف شیخ (بمبئی)

ڈاکٹر محمد عزیز اللہ اسلامک سینٹر (حیدر آباد)

سیٹھ محمد قاسم جادوت (کلکتہ)

سید کمال حسن شیرازی (کراچی)

مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار

الحاج سیٹھ یوسف پٹیل (بمبئی)

الحاج غلام محمد میمن (بڑودہ)

ابن یوسف قاری محمد الیاس (کراچی)

مولانا سید آفتاب المدنی (مدینہ منورہ)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (لکھنؤ)

الحاج مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری (راندیر)

مولانا غلام محمد نورگت (تدکیسر)

مولانا الحاج محمد عبداللہ مہتمم جامعہ فلاح دارین (ترکیسر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الحاج ڈاکٹر سید ظفر علی شاہ (بھوپال)

الحاج مولانا سید عبدالحق قادری آف عطرستان (سورت)

کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، ان تعزیتی خطوط اور پیغامات کا بھی ایک سیلیکشن ان صفحات میں شامل اشاعت کیا جارہا ہے

ماہنامہ الثقافۃ الاسلامیہ دیوبند کا عربی مقالہ اور ماہنامہ مسلم انڈیا کا انگلش متن جوں کا توں ہم اپنے صفحات پر نقل کررہے ہیں کہ اصل عبارت کی حلاوت اور سلاست سے ناظرین کرام لطف اندوز ہوسکیں۔

مرحوم شیخ محمد عبداللہ وزیراعظم ورہبر کشمیر کو عمر کی آخری دو دہائیوں میں حضرت مفتی صاحب سے بہت قرب رہا۔ اس تعلق خاطر کی ابتدا، حرم بیت اللہ کی مقدس فضا میں ہوئی تھی جہاں یہ دونوں حضرات ۱۹۶۵ء میں خاص ایام حج کے موقع پر رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لئے جمع ہوئے تھے۔ وقتاً فوقتاً ان دونوں رہنماؤں میں ملکی اور ملی مسائل پر ملاقاتوں کے علاوہ مراسلت بھی ہوتی رہتی تھی، چنانچہ ان ہی صفحات میں مفتی صاحب کے نام مرحوم شیخ کے دو خط بھی آپ کے مطالعہ سے گزرینگے جو اجتماعی اور ملی معاملات میں شیخ صاحب کی دردمندیوں اور تعمیری انداز فکر کے ترجمان ہیں۔

(انیس الحسن)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تجویز تعزیت

مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف برصغیر کے بلکہ عالم اسلام کے نہایت ممتاز عالم دین، صاحب نظر مفتی، بہترین سیاست داں، اور غیر معمولی طور پر معاملہ فہم، اور صاحب فہم و فراست تھے۔ اس لئے ان کا حادثۂ وفات جو ۱۰ رشعبان ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۲ رمئی ۸۴ء کو ایک طویل علالت کے بعد دہلی میں پیش آیا۔ عالم اسلام کا عموماً اور دارالعلوم دیوبند کے لیے خصوصاً ایک عظیم حادثۂ فاجعہ ہے اور اس کا جس قدر بھی غم کیا جائے کم ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے ساتھ حضرت مرحوم کا نہ صرف ذاتی اور شخصی طور پر بلکہ خاندانی حیثیت سے بھی بہت گہرا ربط اور تعلق تھا۔ حضرت مرحوم کے دادا مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں کے ہمراہ تھے پھر آپ کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ شیخ المشائخ و مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند اور آپ کے اعمام محترمان حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی شیخ الاسلام پاکستان۔ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند، ان تینوں کا شمار اکابر علما دارالعلوم دیوبند میں ہوتا ہے۔ اور تینوں حضرات کی جو گراں قدر علمی، دینی اور روحانی خدمات ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ان بزرگوں کی روایات کو پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رکھا، اور ان کو جلا دی۔ چنانچہ آپ نے ایک عرصہ تک نہایت ممتاز مدرس کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند کی خدمات انجام دیں۔ اور پھر ایک عرصہ تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن کی حیثیت سے آپ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو خدمات انجام دی ہیں وہ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا روشن باب ہے۔

آپ کی فہم و فراست معاملہ فہمی، اور سنجیدہ آرا رکا مجلس شوریٰ ہمیشہ احترام کرتی رہی ہے اور اس نے آپ کی خدمات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کو دارالعلوم دیوبند سے اس درجہ عمیق قلبی روحانی تعلق تھا کہ جب تک صحت نے اجازت دی مجلس شوریٰ کی میٹنگ میں پابندی اور اہتمام سے آتے تھے۔ اور اسکی کارروائیوں سے مکمل طور پر دلچسپی لیتے تھے مجلس شوریٰ اس حادثۂ فاجعہ پر اپنے قلبی رنج والم کا اظہار کرتی ہے۔ اور دعا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو جنت الفردوس میں ابرار وصلحاء کا مقام عطا فرمائے۔ اور حضرت مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتی ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کی قرارداد

مجلس عاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا یہ اجلاس حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے حادثۂ وفات پر اپنے انتہائی غم کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت مرحوم کے اعزا کے ساتھ ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہے کہ وہ حضرتؒ کو بلند مدارج عطا فرمائے۔ اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے ——— آمین۔

حضرت مفتی صاحبؒ عالی دماغ مفکر زبردست عالم دین، جنگ آزادی کے مجاہد اور ملت اسلامیہ کے عظیم قائد و رہنما تھے مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لئے شروع سے فکرمند رہے۔ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام میں حضرت مرحوم نے قائدانہ حصہ لیا۔ اور شروع سے بورڈ کے نائب صدر رہے۔ اور بورڈ کی قیادت و رہنمائی کرتے رہے۔ یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ حضرت مرحوم کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حادثۂ وصال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔
عاملہ کا یہ اجلاس پھر حضرت مرحوم کی مغفرت اور ترقی درجات کے لیے دُعا کرتا ہے۔

جامعہ حسینیہ راندیر (گجرات)

حضرت مولانا رحؒ نے نصف صدی تک قوم وملّت کی خدمات جلیلہ انجام دیں۔ آپ ایک وقت جمیعۃ علمائے کے صدر اور تادمِ وفات مجلس مشاورت کے صدر رہے ہے۔ ان کی وفات ملتِ اسلامیہ کا زبردست نقصان ہے اور یہ سانحہ فاجعہ قومی، ملیّ خادثہ ہے۔

جامعہ حسینیہ راندیر سورت گجرات بھی مولانا کے سانحۂ وفات کو ایک نقصان عظیم سمجھتا ہے۔ اور مولانا کے متعلقین کے ساتھ اس غم میں شریک ہے۔ میں اپنی طرف سے اور جامعہ کی طرف سے تعزیت اور اظہار ہمدردی کرتا ہوں۔ دُعا ہے کہ خداوند کریم مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں درجاتِ عالیہ عطا فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔

اسمٰعیل حافظ احمد

دارالعُلوم حرم مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ

مخدوم ومکرم ومحترم حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی زاد مجدہ

سلام مسنون۔ ابھی قلوب حضرت شیخؒ اور حضرت مولانا طیب صاحبؒ کی جدائی کے صدموں سے یکسو نہیں ہوئے تھے کہ قافلۂ اکابر کا ایک اور راہرو امت مسلمہ کو داغ مفارقت دے گیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب قبلہؒ کو آخرت کے اعلیٰ مقامات سے نوازے۔ اور ان کے لگائے ہوئے درختوں ندوۃ المصنفین اور برہان کو ہمیشہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرسبز و شاداب رکھے کہ آپ ماشاء اللہ روز اول سے ان کے ان کارہائے جلیلہ میں شریک عمل ہے۔ مفتی صاحب قبلہ کی وفات سے تقسیم سے قبل قرول باغ کی ہزاروں یادیں اور نقوش تازہ ہوگئے۔ جس طرح چند ماہ قبل آپ کی تشریف آوری سے روح جھوم جھوم اٹھی تھی، بے اختیار دل چاہ رہا ہے کہ ان پرانے نقوش اور یادوں کو قلمبند کر دوں۔ والسلام

محمد مسعود شمیم۔ ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ

مسلک اہل حدیث کا ترجمان دہلی کا اداریہ

(جون ۱۹۸۴ء)

مفتی صاحب مرحوم دیوبند میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ گجرات بھی گئے۔ ۱۹۳۷ء میں وہ کلکتہ سے دہلی تشریف لائے جہاں انہوں نے مولانا آزاد مرحوم کے مشورے پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم کے ساتھ ندوۃ المصنفین کی بنیاد ڈالی۔ جس نے گذشتہ نصف صدی میں تفسیر، سیرت، تاریخ، ادب، لغت پر سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ اس کا رسالہ برہان اپنے معیار کے اعتبار سے ہندو پاکستان کے ممتاز علمی جرائد میں سے ایک ہے۔

مفتی صاحب جمعیۃ علمائے ہند کے ممتاز اراکین میں سے تھے۔ ایک زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور مولانا محمد میاں صاحب کو ہی جمعیۃ علمائے ہند سمجھا جاتا تھا۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب کے بعد انہوں نے ہندوستانی مسلم جماعتوں کے مشترکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اور تا حیات اس کے صدر رہے۔ وہ مختلف جماعتوں اور افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں بہت ہی اچھا رول ادا کرتے تھے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس اور اس کے کام و پروگرام کو آگے بڑھانے میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ اور آخر تک اس سے وابستہ رہے۔

مرحوم دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ اور قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کے زبردست حامی تھے۔ انہوں نے دارالعلوم کی نئی انتظامیہ یا مجلس شوریٰ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ اپنی علالت کے دوران بھی مرحوم دارالعلوم کا بار بار تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

ان کا دفتر ندوۃ المصنفین ہمیشہ بڑے لوگوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ مفتی صاحب کی میٹنگیں بھی اسی دفتر میں ہوتی تھیں۔

وہ بہت عمدہ خطیب، دور اندیش مشیر، اور حلیم الطبع انسان تھے۔ ملی مسائل میں بھرپور دلچسپی لیتے تھے۔ سرکاری عہدوں کے کبھی قریب نہیں گئے۔ جمعیت علمائے ہند میں شخصیت پرستی کی خرابی و کمزوری آجانے سے حضرت مفتی صاحب کی شخصیت کا وزن نہیں محسوس کیا گیا۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ جس کی وجہ سے مفتی صاحب شخصیت پرستوں سے الگ تھلگ رہنے لگے۔

اللہ تعالےٰ مرحوم کی نیکیاں قبول فرمائے۔ ان کی مغفرت فرمائے۔ اور ملت کیلئے جو کام اور پروگرام انہوں نے جاری کئے تھے۔ انہیں ترقی بخشے۔ آمین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کل ہند مسلم مجلس مشاورت کا خراج عقیدت

کل ہند مسلم مجلس مشاورت کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال پُرملال کو مسلمانان ہند کے لیے ایک عظیم سانحہ قرار دیتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب ایک معروف عالم دین، جنگ آزادی کے بے لوث مجاہد اور مسلمانان ہند کے سچے ہمدرد و بہی خواہ تھے۔ آپ نے حادثات کے سلسلہ میں ہمیشہ بالخصوص ۴۷ء کے بعد مسلمانوں کی تمام اجتماعی و ملی تحریکات میں قائدانہ رول ادا کیا۔ ۱۹۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت کے قیام سے لے کر تادم واپسیں اس سے وابستہ رہے۔ اور ڈاکٹر سید محمود صاحب کے بعد مشاورت کی صدارت و سرپرستی فرماتے رہے۔ مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد اور جماعتوں کو جوڑے رکھنے کی بے پناہ صلاحیت اللہ نے انھیں عطا کی تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ مسلمانوں کے تمام ہی طبقات کے دہلی میں آخری مرجع تھے۔ مسلم و غیر مسلم، سیاسی و غیر سیاسی رہنماؤں سے ہمیشہ آپ کا ربط رہا۔ اور وہ بھی حضرت مفتی صاحب سے استفادہ کرتے رہے۔ امانت و دیانت، صبر و قناعت کے پیکر تھے۔ اور جاہ و منصب اور مال و دولت کیلئے خواہاں کبھی ہوتے ہی نہیں۔ اپنی اجتماعی و ملی سرگرمیوں کے ساتھ آپ ندوۃ المصنفین کے ذریعہ علماء اور دانشوروں کی خاموش تربیت بھی فرماتے رہے۔ ایک اچھے عالم، مفکر اور عظیم ملی رہنما سے آج ملت اسلامیہ ہند محروم ہوگئی۔ مشاورت کے عہدیدار و اراکین تمام مسلمانوں کے ساتھ موصوف کے ورثاء کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

یہ اجلاس حضرت مفتی صاحب کی مغفرت اور ترقی درجات کے لیے دعا کرتا ہے۔ اور وارثین سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پندرہ روزہ ہماری زبان کا اداریہ

۱۲ مئی ۸۴ء کی دوپہر تقریباً سوا تین بجے علم و فضل کا روشن ترین آفتاب ڈوب گیا۔ یعنی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کافی عرصے سے فالج کے شکار تھے۔ اور اسی لیے تقریباً ڈیڑھ سال سے صاحب فراش تھے۔ ۱۳ مئی صبح ۸ بجے جامع مسجد میں شاہی امام مولانا عبداللہ بخاری نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مفتی صاحب کا جنازہ ٹیا محل اور ترکمان گیٹ کے راستے قبرستان مہندیان لے جایا گیا۔ یہ وہ قبرستان ہے جہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ ان کے خاندان کے دوسرے افراد اور مومن خاں مومنؔ جیسے شاعر یہاں مدفون ہیں جنازے کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامل تھے۔ اس علاقے کے لوگوں نے احتراماً دکانیں بند کردی تھیں۔ ٹھیک دس بجے مرحوم کی تدفین عمل میں آئی۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی ابتدائی تعلیم دیوبند ہی میں ہوئی۔ مفتی صاحب کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں اپنے والد کے علاوہ حضرت شیخ الہند اور علامہ انور شاہ کشمیری سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مفتی صاحب کافی عرصے تک دیوبند ہی میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اس کے بعد گجرات کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں استاد مقرر ہوئے۔ جہاں کئی سال تک فقہ، حدیث اور تفسیر کی تعلیم دیتے رہے۔ سیاسی وجوہ سے مفتی صاحب کو گجرات چھوڑ کر کلکتہ آنا پڑا۔ جہاں انہوں نے تقریباً ۵ سال مذہبی تعلیم دی۔ کلکتہ سے جب نکلے تو مفتی صاحب نے کبھی ملازمت نہیں کی کلکتہ کے قیام کے دوران ہی مفتی صاحب نے ندوۃ المصنفین جیسے تاریخی ادارے کی بنیاد رکھدی تھی۔ مفتی صاحب نے سوچا کہ اس طرح کا ادارہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر دہلی منتقل کر دیا جائے تو کام کرنے کی بہتر سہولتیں فراہم ہو جائیں گی۔

۱۹۳۷ء میں یہ ادارہ قائم ہوا اور اس ادارے کے قائم کرنے والوں میں مفتی صاحب کے علاوہ مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا بدر عالم شامل تھے۔ تقریباً انہی دنوں ایک ماہنامہ "برہان" کے نام سے جاری کیا گیا۔ جو اب تک بڑی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ ندوۃ المصنفین نے بے شمار ایسی کتابیں چھاپی ہیں جو اسلامی علوم کے فنون، تاریخ، سیرت اور تصوّف پر بہترین اور اعلیٰ درجے کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

مفتی صاحب ہندوستانی سیاست میں بھی حصّہ لیتے تھے۔ جب مفتی صاحب گجرات میں تھے تو گاندھی جی نے نمک ستیا گرہ کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کے حق میں مفتی صاحب نے ایسا فتویٰ دیا کہ تحریک میں غیر معمولی جان پڑ گئی۔ اس فتوے کی مفتی صاحب کو سزا یہ ملی کہ انھیں گجرات چھوڑنا پڑا۔ مفتی صاحب قوم پرور، سیکولر اور خدا پرست انسان تھے۔ مسلمانوں پر جب بھی کبھی ظلم ہوتا مفتی صاحب اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتے اور عملی طور پر جو کچھ کر سکتے تھے اس سے کہیں زیادہ کرتے۔

مفتی صاحب مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر تھے۔ ایک طرف انہوں نے مسلم پرسنل لا کی افادیت اور اس کے تحفظ کی ضرورت کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا اور دوسری طرف حکومت کو مجبور کیا کہ وہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہ کرے۔ اگر مسلم پرسنل لا اب تک بدستور باقی ہے تو اس میں سب سے زیادہ مفتی صاحب کی کوششوں کو دخل ہے۔ مفتی صاحب مجلس مشاورت کے صدر بھی تھے۔ مفتی صاحب کی وجہ سے مجلس فرقہ واریت کی شکار نہیں ہوئی بلکہ اپنے ابتدائی دور میں اس تنظیم نے ہند مسلم فسادات کے خلاف زبردست جدّوجہد کی اور مسلمانوں میں پیدا ہونے والی ایسی مایوسی اور ناکامی کے احساس کو دور کیا جو ہولناک فسادات اور بربادیوں کا ایک گونہ قدرتی نتیجہ تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صاحب تعلیمی، علمی اور ادبی اداروں میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ اور بہت سے اداروں سے وہ وابستہ تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے لائف ممبر تھے۔ اور تقریباً پچھلے تیس سال سے انجمن سے وابستہ تھے۔ مرحوم کی وفات سے بہت سے ادارے ایک ہمدرد اور دردمند انسان کی رہنمائی سے محروم ہوگئے۔

بیان جذبات

ماہنامہ "مستقبل"، بمبئی

حقیقت یہ ہے کہ ان کے انتقال سے ملت اسلامیہ کا ایک عظیم ستون گر گیا اور مسلمانانِ ہند ایک عظیم مذہبی رہنما ایک عظیم مفکر اور ایک عظیم روشن خیال شخصیت سے محروم ہوگئے۔

ادارۂ "مستقبل" کے لیے یہ بات عزت وافتخار کا باعث ہے کہ وہ شروع سے ہی اس کے مشاورتی بورڈ سے وابستہ رہے۔ مرحوم نے بیماری کی حالت میں بھی "مستقبل" کو ہمیشہ قیمتی مشوروں سے نوازا اور مسلمانانِ ہند میں بیداری اور سماجی شعور پیدا کرنے کے سلسلے میں "مستقبل" کی کوششوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہی نہیں، انہوں نے انتہائی پیچیدہ مسائل خصوصاً فیملی پلاننگ کے موضوع پر شرع اور حدیث کی روشنی میں کھل کر، مدلل طریقے سے اپنے اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا اور مسلمانوں کے ذہن سے مختلف قسم کی بدگمانیوں کو دور کیا۔ صاف ذہن رکھنے والے مسلمانوں نے ان کے خیالات سے روشنی حاصل کی اور اپنی زندگی سے تاریکیوں کو دور کیا، لیکن افسوسناک پہلو یہ ہے کہ تنگ نظر افراد نے ان کی ہمہ جہت شخصیت کو سمجھنے کے بجائے انہیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا اور ان کی ذاتِ گرامی پر رکیک حملے بھی کئے۔ یہ بات بلاجھجک کہی جا سکتی ہے کہ آج مسلمانوں کے کسی بھی فرقے میں مرحوم مفتی صاحب جیسا روشن خیال مذہبی رہنما موجود نہیں ہے۔

آپ نے وطن کی تحریک آزادی میں سرفروشانہ حصہ لیا اور اپنی پرجوش و ولولہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگیز تقریروں سے لوگوں کے دلوں میں آزادی کے جذبوں کی چنگاریاں روشن کیں جمعیۃ علماء ہند میں تقریباً پچاس سال تک سرگرمی، جانفشانی اور خلوص کے ساتھ ملی خدمات انجام دیں۔ آپ جمعیۃ علماء ہند کے صف اول کے رہنماؤں میں شمار کئے جاتے تھے۔ جمعیۃ کے علاوہ تمام مسلم تنظیموں اور بے شمار تعلیمی وسماجی اداروں میں آپ کی صلاحیتوں باصابت رائے اور دانشمندانہ مشوروں کا اعتراف کیا جاتا تھا اور آپ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ کل ہند مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے لئے تو آپ کی ذات گرامی دل اور دماغ کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان تنظیموں کو قائم رکھنے، پروان چڑھانے اور ان کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور فعّال بنانے میں آپ کی شخصیت کلیدی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم ممبر تھے۔ کئی بار سینٹرل حج کمیٹی کے چیرمین رہے۔ سینٹرل وقف کونسل اور وقف بورڈ اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے کورٹ کے ممبر رہے۔

ندوۃ المصنفین (دہلی) جیسے باوقار ادارہ کو قائم کر کے آپ نے ملت اسلامیہ عالم اور دنیائے علم وادب اور دین ومذہب کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ اہل فکر ونظر تسلیم کرتے ہیں کہ سخت اور دشوارکن حالات میں حضرت مفتی صاحب نے ایسا علمی کارنامہ انجام دیا ہے، جس کا مقام تاریخ وادب میں بہت بلند ہے۔ بے شمار موضوعات پر مشتمل ٹھوس علمی وتحقیقی لٹریچر اس ادارے سے شائع ہوا ہے۔

اخلاق وشرافت، شائستگی وتہذیب، بلند حوصلگی، وسعت قلب وفکر، وضعداری وپاسداری کی ایسی پاکیزہ خصوصیات آپ میں پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے آپ نہ صرف مسلمانوں کے تمام طبقوں، بلکہ ملک وبیرون ملک دوسرے لوگوں میں بھی نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ صحیح معنوں میں انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کا بہترین مجسمہ اور نکھرا ہوا نمونہ تھے۔ ملک میں نہ جانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے کتنے نوجوان موجود ہیں، جنہوں نے حضرت مفتی صاحب کی فکر رہنمائی کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں کو روشن کیا ہے اور نہ جانے کتنے لوگوں کا مستقبل آپ کی بدولت روشن ہوا ہے۔

آپ تحریر و تقریر کے میدان کے کامیاب شہسوار تھے۔ زبان و قلم میں بلا کی شگفتگی و دلدوزی تھی آپ کی تقریروں میں علم و روحانیت، فکر و بصیرت اور تحقیق و کاوش کے جوہروں کے ساتھ ساتھ ادب کی چاشنی اور اسلوب کی دلآویزیاں چمکتی نظر آتی ہیں۔ کئی اہم کانفرنسوں کی صدارت فرماتے ہوئے آپ نے جو خطبہ ہائے صدارت پیش کئے ہیں، وہ بھی آپ کی ملی دردمندیوں، فکر و شعور کی پختگی، علم و دانش کی روشنی اور بلند پایہ تجربوں کا گراں قدر اور قابل استفادہ نچوڑ ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے دینی و مذہبی موضوعات پر آپ کی تقریریں کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔

درحقیقت حضرت مفتی صاحب کی ذات گرامی قدیم روایات صالحہ کی قیمتی یادگار تھی۔ عالمانہ تہذیب و شائستگی کی ایک ایسی فلک بوس عمارت آپ کے انتقال سے زمین پر آرہی، جو بڑی دل کش، بڑی بلند پایہ اور قابل حفاظت تھی۔

اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت فرمائے اور آپ کے پسماندگاں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

آہ! مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

ماہنامہ "دین دنیا" دہلی

نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ پورے ملک کی یہ انتہائی بدبختی ہے کہ "حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ڈھائی سال کی طویل علالت کے بعد ۱۲ مئی کو ہم سے جدا ہو گئے۔ اور اور ۱۳ مئی کو حضرت شاہ ولی اللہ حضرت شاہ عبدالعزیز حضرت شاہ رفیع الدین اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت شاہ عبدالقادر جیسے بلند پایہ عالموں کے پہلو میں جاکر اس قبرستان مہندیان میں آرام فرما ہو گئے جسے بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادی "شاہ ولی اللہ دہلوی اور آپ کے خانوادہ گرامی نے برصغیر ہند کا جنت البقیع بنا دیا ہے" گویا آپ زندگی میں بھی علماء میں گھرے رہے اور مرنے کے بعد بھی حلقہ علماء میں بدستور شامل رہے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر اور ہمہ صفت ہے جس کی مثال شاید اس زمانے میں ناپید ہے آپ ایک شب زندہ دار بزرگ بھی تھے اور عالم باعمل بھی آپ ایک سحر بیان مقرر بھی تھے اور بے مثال اہل قلم بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی دینی فہم بھی عطا کی تھی اور دنیاوی شعور بھی۔ آپ صف اول کے سیاستداں بھی تھے اور پاکیزہ اخلاق کا مجسمہ بھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کے کردار میں صحابہ کرام کی تقلید کی پوری جھلک پائی جاتی تھی۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے چونکہ دارالعلوم دیوبند کی اس فضا میں تعلیم و تربیت حاصل فرمائی تھی جو دینی قلعہ کے علاوہ جنگ آزادی کا ملک میں سب سے بڑا مرکز تھا اس لئے وہ ایک بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ جنگ آزادی کے سالاروں میں سے بھی تھے۔ اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اس ملک کے مسلمانوں میں سچی اور ایسا ندارانہ حب الوطنی کی اسپرٹ پیدا کرنے میں اس قدر نمایاں حصہ لیا ہے جسے ہمارے ملک کی جنگ آزادی کی تاریخ قیامت تک فراموش نہیں کر سکتی۔

ہمارا اندازہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی آخری اور واحد ہستی تھے جن کی حق پسندی کو اس ملک کے سرکاری اور قومی حلقوں میں یکساں قدر و منزلت کے ساتھ دیکھا جاتا تھا حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کا سیاسی رجحان اگرچہ دوسرے علماء دیوبند کی طرح کانگریس کی جانب رہا ہے لیکن وہ کانگریس کی کوتاہیوں کی بھی برابر نشاندہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے رہتے تھے۔ اور ان کی اس حق گوئی اور صداقت شعاری کو ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں میں بھی بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کی تقریباً سب ہی سیاسی پارٹیوں کے رہنما مفتی صاحب کی حق گوئی اور صداقت شعاری کی بنا پر ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور مفتی صاحب کی سیاسی بصیرت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم نے جہاں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ایک ممبر کی حیثیت سے۔ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر کی حیثیت سے ملت اسلامیہ کی اہم خدمات انجام دی ہیں وہاں انہوں نے مجلس مشاورت کو آگے بڑھانے میں بڑی دل سوزی سے کام کیا ہے مفتی صاحب کی دلی تمنا تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے جتنے بھی الجھے ہوئے مسائل ہیں وہ کسی نہ کسی طرح حل ہو جائیں اور اسی مقصد کے تحت انہوں نے ڈاکٹر سید محمود کی وفات کے بعد "مجلس مشاورت" کے صدر کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ مفتی صاحب چاہتے تھے کہ ہندوستان کی سب ہی مسلم جماعتوں کے رہنما اپنی سیاسی پالیسی کو برقرار رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مشترک بنیادی مسائل کے حل کرنے میں متحد ہو جائیں اور ایک ہی پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے پیچیدہ مسائل کے حل کی تحریک پوری مضبوطی سے چلائیں۔ لیکن افسوس کہ مفتی صاحب مرحوم اس نیک مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہمارے ملک کی مسلم جماعتوں کے رہنماؤں نے مفتی صاحب کی رائے کے مطابق مسلمانوں کے متفقہ مسائل کے بارے میں متحد ہو کر کام کیا ہوتا تو شائد آج مسلمانان ہند کی وہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ملک اور وطن پر نیز مسلمانان ہند پر حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے اس قدر احسانات ہیں جنہیں کسی طرح بھی نہیں بھلایا جا سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

सत्यमेव जयते

उप राष्ट्रपति, भारत
नई दिल्ली
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

۱۷ مئی ۱۹۸۴

مکرمی السلام ورحمۃ

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے سانحۂ ارتحال کی

خبر سنکر مجھے بے حد رنج ہوا۔ آنجناب بذاتِ خود ایک عظیم

شخصیت، ایک عظیم شخصیت، ایک عالم دین، ایک محب وطن

اور نہایت سادہ مزاج انسان تھے۔ خدائے پاک ان

کی روح کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں اور

پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

والسلام۔

مخلص۔

ہدایت اللہ

سابق وزیر اعظم ہند اندرا گاندھی کا اظہارِ غم

حضرت مفتی صاحبؒ کی وفات کی خبر سن کر اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کہا۔ ـــــــ (ہندوستان ٹائمز، دہلی)

"مجھے اس خبر سے دلی صدمہ پہنچا، مرحوم ایک ممتاز عالم

قوم پرست مفکر تھے، اُن کا اٹھ جانا پورے ملک

اور قوم کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الحاج ذوالفقار اللہ صاحب (سابق وزیر حکومت ہند)

مکرمی منیب الرحمٰن صاحب۔ اسلام علیکم

اخبارات سے جناب کے والد صاحب قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن کے انتقال کی خبر معلوم ہوکر بیحد رنج ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائیں اور بلند درجات عطا فرمائیں۔ نہایت نیک خصلت اور ملت کے بڑے درد مند بزرگ تھے، میرے بڑے کرمفرما۔ بیماری کے درمیان بھی جب میں دہلی جاتا تھا برابر ملاقات کرتا تھا۔

اپنے سب بہن بھائیوں اور دیگر خاندان والوں سے میری طرف سے تعزیت کردیجئے۔

والسلام۔

محمد ذوالفقار اللہ

۱۵ر مئی ۱۹۸۴ء

※

لوک دل لیڈر ہیم وتی نندن بہوگنا ایم۔پی (سابق وزیر حکومت ہند)

جناب مجیب صاحب!

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر سنکر قلبی رنج ہوا۔ مفتی صاحب نے ملک کی جنگِ آزادی میں جس سرگرمی سے حصہ لیا۔ اُسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ مہاتما گاندھی نے جب نمک اندولن شروع کیا۔ تو مفتی صاحب نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ صادر کرکے ملک کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ علم دین کی ترویج واشاعت کے لئے انھوں نے جو عملی اقدامات کئے، اُن کی ہمیشہ ایک سرمایہ کی طرح حفاظت کی جائے گی۔ مسلمانوں کے کاز کے لئے مرحوم نے ہمیشہ تعمیری رُخ اپنایا۔ مسلم پرسنل لا کی حفاظت کے لئے مرحوم نے بڑی اہم خدمات انجام دیں۔ ان کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے بڑی مشکل سے پُر ہوسکے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ مرحوم کا سایہ دیر تک قائم رہا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ نیز آپ سب متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

آپکا مخلص

ہیم وتی نندن بہوگنا

الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ صدر انڈین مسلم لیگ وممبر پارلیمنٹ

آج ہی مالابار علاقے سے انتخابی مہم کے بعد واپس آیا۔ حضرت مولانا مفتی صاحب کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی، بے حد صدمہ ہوا۔ مفتی صاحب کا رحلت کر جانا ملت اسلامیہ کا ایسا عظیم نقصان ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ آپ نے نہایت ہی صبر آزما دور میں مسلم مجلس مشاورت کے صدر کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند کی جس انداز سے قیادت فرمائی اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ آپ میں تمام جماعتوں کو اپنے ساتھ لے چلنے کی جو بے پناہ صلاحیت تھی اس کا اعتراف نہ کرنا حقیقت کی پردہ پوشی ہوگی۔

حضرت مولانا مفتی صاحب کے تبحر علمی اور ان کی مسائل پر گہری نظر کا اعتراف لازمی ہے۔ اس کے ساتھ جو محبت وخلوص میں نے ان میں پائی اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ہے ہمارے بیس سالہ تعلقات کے دوران جو شفقت آمیز سلوک میرے ساتھ ان کا رہا ہے۔ اس کی یاد تا دیر باقی رہے گی۔ اور ان کے لئے بے اختیار احترام کا جذبہ ابھر آتا ہے حضرت مولانا سے تعلقات میرے لئے ایک قابل فخر بات ہے۔

حضرت مولانا مفتی صاحب کی ذات خود ایک انجمن تھی اور ایسا بلند مقام اور ایسی اعلیٰ قابلیت رکھنے والی شخصیتوں میں آخری شمع تھی۔ اب ایسی شخصیت کا پانا صدیوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک محال و مشکل ہوگا۔ ایسی عظیم المرتبت شخصیتوں کے تعلق ہی سے علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ابھی دو ہفتہ بیشتر ملاقات پر کیرلا کے دورے کا ذکر فرمایا تھا۔ اور انھیں پندرہ سال پرانی ہر بات یاد تھی۔ دار العلوم کے سلسلہ میں ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔ مسلم مجلس مشاورت تو ان کی زندگی کا مشن بن چکی تھی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر کی حیثیت سے بورڈ کی ذمہ داریوں کو پوری طرح آخر دم تک انجام دیتے رہے۔

آپ سے، تمام بھائیوں اور پورے خاندان سے اپنے گہرے جذباتِ ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔ حضرت مولانا مفتی صاحب پوری ملت کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ آج پوری ملت سوگوار ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ تمام متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ اور حضرت مفتی صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

شریکِ غم

ابراہیم سلیمان (۱۵ مئی ۱۹۸۴ء)

※

عقیل محمد صاحب وکیل میرٹھی۔ مہاجر و مقیم مدینہ منورہ

عزیزم عبید الرحمٰن سلمہٗ السلام علیکم

اتوار کے روز بذریعہ مولانا آفتاب سلمہٗ یہ صدمہ انگیز خبر موصول ہوئی۔ کہ آپ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والد بزرگوار جناب حافظ حاجی مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اس دار فانی سے کوچ فرما گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ چونکہ ایک ماہ قبل سے حضرت موصوف کی شدید علالت کی خبریں مل رہی تھیں اس لئے حادثۂ ناگہانی تو نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خود میرے سر پر سے ایک سایہ اُٹھ گیا۔ میں ہمیشہ ان کو اپنا خاص مشفق مُربّی تصوّر کرتا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ وہ میرے بزرگ محترم بھی تھے اور بے تکلف دوست بھی تھے۔ جب سے میں مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ حضرت موصوف کو برابر یہ فکر رہتی تھی۔ کہ یہاں میری معاش کا کیا انتظام ہوگا۔ اور خطوں میں یہ دریافت فرماتے تھے۔ کہ مجھے عربی بول چال کی مشق ہو گئی کہ نہیں حقیقت یہ ہے کہ حضرت موصوف کی ہستی ایسی تھی کہ اُن کی وفات صرف میرا یا آپ کا نقصان ہی نہیں ہے بلکہ دہلی اور ہندوستان کے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا۔ یہاں جو خدّام سلسلہ ہیں انھوں نے قرآن شریف کے ختم کرائے ہیں۔ اور مکہ معظمہ میں بھی ختم قرآن ہوئے ہیں۔ نہ معلوم کس طرح یہ حرم نبوی میں وفات کی خبر پھیلتی جا رہی ہے۔ مجھے حرم شریف میں ایسے غیر متعلق لوگ ملے جنہوں نے دوسرے ذرائع سے خبر کی تصدیق حاصل کی اور بطور خود ختم قرآن کرائے۔

آپ کے والد بزرگوار کی وفات سے پوری ایک بساط اُلٹ گئی۔ اور ہمارے بزرگوں کا ایک دَور ختم ہو گیا۔ اور اب آگے اندھیرا ہی نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اور آپ سب متعلقین کو صبر و سکون مرحمت فرمائے۔ میری جانب سے اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں اور سب بھائیوں کو کلمات تعزیت پہنچا دیجئے۔

میرے یہاں قیام کو اب نواں سال چل رہا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالےٰ یہیں ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔

خادم: عقیل محمد

معرفت پوسٹ بکس ۳۴۲

مدینہ منورہ سعودی عرب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمہ اللہ

مولانا محمد منظور نعمانی
مدیر ماہنامہ الفرقان لکھنؤ

۱۰ر شعبان (۲۲ر مئی) شنبہ کا دن تھا، راقم سطور نماز مغرب سے فارغ ہوا تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ اور اس کے عربی ماہنامہ البعث الاسلامی کے مدیر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے فون پر بتلایا کہ دہلی سے ٹیلی فون سے اطلاع ملی ہے کہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب انتقال فرما گئے۔ خبر سن کر قرآن مجید کی تعلیم و تلقین کے مطابق یہی کلمہ زبان پر آیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں، وہی ہمارا خالق و پروردگار اور مالک و حاکم ہے اور ہماری حیات و موت اور سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے اور ہم سب یہاں کی زندگی پوری کر کے اسی کی طرف لوٹنے والے اور اسی کے حضور میں حاضر ہونے والے ہیں) اس کلمہ نے اپنی موت بھی آنکھوں کے سامنے کر دی اور سوچنے لگا کہ یہی دن (بظاہر جلدی ہی) میرے لیے بھی آنے والا ہے، اُس وقت میری سب سے بڑی طلب اور حاجت یہ ہوگی کہ رب کریم رحم و کرم کا معاملہ فرمائے۔ اس خیال کے آتے ہی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مفتی صاحب کے لئے اور خود اپنے لیے مغفرت و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رحمت کی دعا میں مشغولیت نصیب ہو گئی ۔ اس عاجز نے اسی کو اُن کے ساتھ دیرینہ تعلق کا حق اور اُس دوسرے عالم میں جہاں وہ پہنچ گئے، اُن کی ممکن خدمت اور راحت رسانی کا وسیلہ سمجھا، اللہ تعالیٰ آئندہ بھی اُن کے حق کے مطابق اس کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے ۔ رب اغفر وارحم و انت خیر الراحمین

مفتی صاحبؒ سے تعارف اور تعلق

اب سے اکسٹھ سال پہلے ۱۳۴۳ھ میں جب راقم سطور ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تو پہلی دفعہ اسی وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو دیکھا تھا۔ وہ اُس وقت ۲۳۔ ۲۴ سال کے جوان تھے ۔ دو سال پہلے ۱۳۴۱ھ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کر چکے تھے ۔ اُس وقت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ عہدہ کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم تھے لیکن اہتمام کا سارا کام وہی انجام دیتے تھے ۔ اس لیے عملاً گویا وہی مہتمم تھے ۔ ان کا دستور تھا کہ دارالعلوم کے فضلاء و فارغین میں جو بھی استعداد کے لحاظ سے ممتاز ہوتے وہ معین المدرس کی حیثیت سے ان کو دارالعلوم میں لے لیتے اور ابتدائی درجات کی تعلیم و تدریس کا کام ان سے لیتے ۔ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب علمی استعداد کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے تعلیم کے آخری سال یعنی دورۂ حدیث میں انھوں نے اپنی پوری جماعت میں اعلیٰ نمبر حاصل کر کے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی تھی، اس لیے ان کو معین المدرس کی حیثیت سے دارالعلوم میں لے لیا گیا ان کے والد ماجد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اس زمانہ میں دارالعلوم کے مفتی تھے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ان کی نگرانی میں افتاء (فتویٰ نویسی) کا کام بھی کرتے تھے ۔ اس وجہ سے ان کو نائب مفتی بھی کہا جاتا تھا ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے مزاج میں فطری طور پر کم آمیزی ہے جو دار العلوم کی طالب علمی کے اس زمانہ میں حد سے بڑھی ہوئی تھی، بے ضرورت کسی سے ملنے ملانے کا بالکل معمول نہیں تھا۔ میں اپنی طالب علمی کے آخری مرحلے میں دیوبند گیا تھا۔ اس لیے صرف انہی اکابر اساتذہ سے اس زمانہ میں اس عاجز کا تعلق رہا جن کے یہاں میرے اسباق ہوتے تھے۔ اس لیے اس زمانہ میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔ بس اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ معین المدرس اور نائب مفتی ہیں۔

شعبان ۱۳۴۵ھ میں دار العلوم کی میری طالب علمی کا دور ختم ہوگیا اور میں دورۂ حدیث کا امتحان دے کر مکان آگیا۔ اپنی جس فطری کم آمیزی کا اوپر ذکر کیا ہے اس کی وجہ سے میں اس بات سے تقریباً بے خبر رہا کہ دار العلوم میں اوپر کی سطح پر کچھ اختلافات ہیں، یہ میرے مکان پہ آجانے کے بعد جلد ہی اخبارات اور بعض دوسرے ذرائع سے معلوم ہونے لگا کہ ان اختلافات نے سنگین صورت اختیار کرلی اور اس کے نتیجہ میں اس وقت کے صدر المدرسین اور شیخ الحدیث استاذنا حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ساتھ دیگر متعدد اکابر اساتذہ نے دار العلوم سے تعلق قطع کرلیا۔ ان حضرات کے ساتھ جن نوجوان اساتذہ نے دار العلوم سے قطع تعلق کیا تھا اُن میں مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بھی تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ سب حضرات گجرات ضلع سورت کی بستی ڈابھیل کے مدرسہ تعلیم الدین میں اجتماعی طور پر بلالیے گئے اور اس کے بعد سے وہ مدرسہ جامعہ اسلامیہ ہوگیا اور اس طرح دار العلوم کے اختلاف کے اس شر سے یہ خیر پیدا ہوا کہ گجرات میں کم از کم تعلیم کی سطح پر دار العلوم دیوبند جیسا ہی ایک جامعہ اسلامیہ قائم ہوگیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اس وقت اس قافلہ کے ساتھ تشریف نہیں لے گئے دیوبند ہی میں اپنے مکان پر اور اپنی مسجد کے حجرہ ہی کو اپنی قیام گاہ بنالیا، لیکن مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قافلہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریس کے علاوہ افتار کی ذمہ داری بھی اُن کے سپرد رہی ــــــ

کچھ عرصہ کے بعد آب وہوا کی ناموافقت کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے مستعفی ہوکر چلے آئے اور پھر چند سال کلکتہ میں قیام فرمایا، یہاں درس قرآن اور خطابت وموعظت خاص مشغلہ رہا، کلکتہ کے اس قیام ہی کے زمانے میں ایک تصنیفی اشاعتی ادارے کے قیام کا خاکہ بنایا اور پھر اس کام کے لیے مستقل دہلی آگئے اور اپنے قدیم رفقاء مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے اشتراک وتعاون سے یہ ادارہ ندوۃ المصنفین کے نام سے قرول باغ دہلی میں (۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء) میں قائم کیا اور اس کا ماہنامہ برہان جاری کیا۔ ادارہ کے انتظام کی ذمہ داری خود سنبھالی۔

الفرقان ۱۳۵۳ھ (۱۹۳۴ء) میں بریلی سے جاری ہوچکا تھا لیکن کئی سال تک اس کی طباعت دہلی میں ہوتی تھی۔ راقم سطور ہر مہینہ اس کی کاپیاں لے کر چھپوانے کے لیے خود دہلی جاتا تھا۔ ندوۃ المصنفین قائم ہوجانے کے بعد سے مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کا قیام قرول باغ ہی میں رہتا۔ یہ عاجز اُس زمانے میں جب بھی دہلی جاتا، ان حضرات کی ملاقات کے لیے قرول باغ ضرور جاتا اور کبھی کبھی دن کا زیادہ وقت وہیں گزرتا۔

ملک کی تقسیم کے فیصلہ کے بعد ۱۹۴۷ء میں دہلی میں جو فسادات ہوئے اور دہلی کے مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اس میں ندوۃ المصنفین بھی برباد ہوگیا تھا۔ قرول باغ مسلمانوں سے بالکل خالی ہوگیا تھا اور بظاہر اسباب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ندوۃ المصنفین کے بقا کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی لیکن فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اور بظاہر اسباب مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی دانشمندی، عزم وہمت اور مولانا حفظ الرحمٰن کی جد وجہد سے وہ پھر قائم ہوا۔ جامع مسجد کے علاقہ میں اس کے لیے ایک مناسب مکان حاصل کرلیا گیا۔ بفضلہ تعالیٰ وہ اسی میں قائم ہے۔ اس کا ماہنامہ برہان مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ادارت میں جاری ہوا تھا، اب تک انہی کی ادارت میں جاری ہے بعد کے اس دور میں بارہا ایسا ہوا کہ کسی ضرورت سے دہلی جانا ہوا تو ندوۃ المصنفین ہی میں قیام کیا۔

راقم سطور ۱۳۶۳ھ ۱۹۴۴ء میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا رکن منتخب کرلیا گیا اس کے ۴۔۵ سال بعد ۱۳۶۸ھ میں مفتی صاحب بھی اس کے رکن منتخب ہوگئے۔ اُس وقت سے دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اور عاملہ کے جلسوں میں برابر ساتھ شرکت ہوتی رہی۔ ۱۹۶۵ء میں مجلس مشاورت قائم ہوئی اس میں بھی اس وقت تک ساتھ رہا جب تک کہ راقم سطور اور اس کے اصل بانی ڈاکٹر سید محمود نے استعفا دے کر بے تعلقی اختیار نہیں کی۔

قریباً نصف صدی کے اس قریبی تعلق میں میں نے مفتی صاحب کے بارے میں جو کچھ جانا اس کو مختصر الفاظ میں اس طرح عرض کیا جاسکتا ہے کہ وہ نہایت ذہین، فہیم وفطین اور معاملہ فہم عالم دین تھے۔ تقریر اور تحریر پر یکساں قدرت تھی۔ موقع پر ضرورت کے مطابق بات کرلے کی اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت عطا فرمائی تھی اگر ندوۃ المصنفین کی انتظامی ذمہ داری نہ سنبھالی ہوتی اور اپنے کو انھوں نے تدریس وتصنیف جیسے علمی کاموں میں مشغول کیا ہوتا تو وہ حدیث وتفسیر وغیرہ علوم دینیہ کے درجۂ اول کے اساتذہ اور صفِ اول کے مصنفین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہوئے لیکن ماشاء اللہ کان ومالم یشاء لم یکن

وہ حافظ قرآن بھی تھے اور قرآن مجید بہت ہی اچھا پڑھتے تھے۔ رمضان مبارک میں وہ تراویح تو قریب کی مسجد میں قرآن مجید سنانے والے امام ہی کے پیچھے پڑھتے تھے لیکن نوافل میں اپنا قرآن مجید ختم کرنے کا معمول تھا جو غالباً اُن کی اُس علالت تک جاری رہا جس کا انجام اب ان کے سفر آخرت پر ہوا۔

قریباً سوا دو سال ہوتے دارالمصنفین اعظم گڑھ میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر عالمی مجلس مذاکرہ تھی مفتی صاحب نے اس میں شرکت فرمائی تھی۔ وہ اس سے فارغ ہوکر ہاوڑہ، دہرہ دون ایکسپریس سے واپس آرہے تھے۔ دوسرے رفقاء سفر کے علاوہ ان کے خاص رفیق مولانا سعید احمد اکبرآبادی بھی ساتھ تھے۔ بارہ بنکی کا اسٹیشن آنے سے پہلے بات کرتے کرتے مفتی صاحب پر فالج کا حملہ ہوگیا۔ ٹرین جب بارہ بنکی اسٹیشن پہنچی تو مولانا اکبرآبادی نے فون کے ذریعہ لکھنؤ کے اسٹیشن ماسٹر کو مفتی صاحبؒ کے بارے میں بتلایا اور کہا کہ ان کو لکھنؤ اتار کر اسپتال پہنچانا ہوگا۔ اس لیے جب ہماری گاڑی لکھنؤ پہنچے تو اسٹیشن پر ڈاکٹر اور ایمبولنس موجود ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب گاڑی لکھنؤ اسٹیشن پہنچی تو مفتی صاحب کو اتار کر ایمبولنس کے ذریعہ یہاں کے بلرامپور اسپتال میں داخل کیا گیا۔ مولانا علی میاں جو اعظم گڑھ سے مفتی صاحب سے پہلے تشریف لا چکے تھے اور دارالعلوم ندوہ میں مقیم تھے، ان کو اسی وقت اطلاع ہوگئی وہ اسی اسپتال تشریف لائے اور دارالعلوم کے چند سعادت مند طلبہ کی ڈیوٹی مفتی صاحب کی خدمت و تیمارداری کے لیے مقرر کردی۔ مجھے دیر رات کے بعد دارالعلوم ہی سے اس کی اطلاع ملی۔ میں صبح بعد نماز فجر ان کو دیکھنے کے لیے اسپتال گیا۔ اس وقت ان کی حالت بہت ہی نازک اور بظاہر مایوس کن تھی، بول بالکل نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکتے تھے۔ اپنے ارادہ سے جسم کے کسی حصہ کو حرکت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے مجھ کو پہچان لیا۔ میں نے اس وقت تسلی کی جو بات کہنا مناسب سمجھی وہ کہی اور اندازہ ہوا کہ انھوں نے میری بات سمجھ لی۔ قریباً ایک ہفتہ لکھنؤ کے اس اسپتال میں قیام رہا۔ حالت کچھ بہتر ہو گئی۔ ان کے صاحبزادے اور داماد اطلاع ملنے پر دوسرے ہی دن آگئے تھے۔ یہاں کے ڈاکٹروں کے مشورہ سے طے ہوا کہ مزید علاج کے لیے ان کو دہلی لے جایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ طویل عرصہ تک دہلی کے ایک اسپتال میں زیر علاج رہے اور حالت تدریجاً بہتر ہوتی رہی، یہاں تک کہ اسپتال سے ان کو گھر لے آیا گیا اور آنے جانے والوں سے معلوم ہوتا رہا کہ نقل و حرکت تو اب بھی مشکل ہے لیکن دماغ صحیح کام کرنے لگا ہے اور بات بھی کرتے ہیں۔

جب وہ لکھنؤ اسپتال میں تھے تو ان کی حالت دیکھ کر شدت کے ساتھ یہ احساس بار بار ہوا کہ قریباً نصف صدی کے اس تعلق کے زمانہ میں مختلف معاملات کے بارے میں رائے کا اختلاف بھی ہوا، اور اس کا کافی امکان ہے کہ میری کسی بات سے ان کو اذیت پہنچی ہو، یا میں نے ان کی غیبت کی ہو یا سنی ہو، یا دل میں کوئی بدگمانی آئی ہو، اس لیے حتی الوسع زندگی ہی میں آخرت کے لیے اپنے معاملہ کو صاف کر لینا چاہیے۔ لیکن یہ خطرہ ہوا کہ اس طرح کی بات سے اُن کو یہ محسوس نہ ہو کہ ہم لوگوں کو اُن کے بارے میں مایوسی ہے۔ اس لیے اُس وقت دل کے اس داعیہ کو دبا یا اور کچھ عرض نہیں کیا۔ پھر جب عرصہ کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دہلی میں اسپتال سے گھر لے آئے گئے ہیں اور حالت کافی بہتر ہے تو میں نے ان کی خدمت میں اس سلسلہ میں عریضہ لکھا اور آخرت کے لیے معافی کی صفائی اور معافی کی درخواست کی۔ قریباً تین مہینے کے بعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صاحب کا لکھایا ہوا عنایت نامہ ملا جس میں انھوں نے لکھایا تھا کہ آپ کا خط تو وقت پر پہنچ گیا تھا لیکن گھر والوں نے اب سے پہلے مجھے دینا مناسب نہیں سمجھا، آج ہی میں نے دیکھا ہے۔ آگے مفتی صاحب نے وہ لکھایا تھا جو اُن کے شایانِ شان تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس احسان کی بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

اب سے کچھ دنوں پہلے ان کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہوئی۔ معلوم ہوا تھا کہ ضعف بڑھ رہا ہے۔ ۱۰ شعبان ۱۲ مئی کو اچانک وہ اطلاع ملی جو اوپر ذکر کی جا چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ فرمائے۔ ناظرین کرام سے بھی اسی کی دعا درخواست ہے۔ اس عاجز پر بھی احسان ہوگا۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

کلماتِ تعزیت (مولانا مسعود احمد صدیقی، اجین)

ابھی ابھی اخبارات میں یہ جانکاہ خبر پڑھی کہ حضرت مفتی صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ ۔۔۔ کیسی المناک خبر ہے واحسرتا! کیسی عظیم الشان شخصیت، تقریر و تحریر کا بادشاہ متانت و وقار، معاملہ فہمی اور عالی ظرفی کا پیکر مجسم، فریادی ہوں کہ میں یتیم ہو گیا، میری قوم یتیم ہو گئی، میرا پورا وطن بے نور ہو گیا۔ آہ! ثم آہ!!!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقشِ تحریر مولانا سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ

۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو ہندوستان کے نامور عالم مولانا مفتی عتیق الرحمان فالج کے موذی مرض میں ایک طویل مدّت تک مبتلا رہ کر ۸۴ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کر کے عالم جاودانی ہوئے۔

ان کے اس مرض کی المناکی دار المصنفین سے بھی بڑی حد تک وابستہ ہے، اس لیے اس ادارہ کے خدام ان کی وفات حسرت آیات سے بہت سوگوار ہیں، فروری ۱۹۸۲ء میں یہاں "اسلام اور مستشرقین" پر جو سیمینار ہوا تھا اس میں وہ شرکت کے لیے تشریف لائے تھے، تین روز یہاں بہت ہنسی خوشی سے گذارے، اس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی، خوش خوش یہاں سے اور شرکاء کے ساتھ روانہ ہوئے تو ریل ہی میں بارہ بنکی کے پاس ان پر فالج کا سخت حملہ ہوا، ان کے ہم سفر مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا سجّاد حسین نے ان کو کسی طرح لکھنؤ کے ہسپتال میں داخل کیا، ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو پھر دہلی لے جائے گئے، اس وقت سے اپنی وفات تک تقریباً سوا دو سال تک بستر ہی پر رہے، خیال ہوتا ہے کہ وہ دار المصنفین کا سفر نہ کرتے تو اس موذی مرض میں مبتلا نہ ہوتے، مگر مشیت ایزدی یہی تھی، راقم ان کی عیادت کے لیے کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا ان کا جسم تو بیکار ہو چکا تھا، مگر دماغ بیدار رہا، گفتگو میں وہی روانی اور شیرینی ہوتی، جو ان کی طبیعت کا مخصوص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رنگ تھا، ہر قسم کے مسائل پر گفتگو کرتے، مگر زیادہ تر دارالعلوم دیوبند کے قضیۂ نامرضیہ پر اظہار خیال کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ وہاں کا المیہ پیش نہ آتا تو اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے اور ہوتے بھی تو اتنے دنوں تک بستر علالت پر پڑے نہ رہتے، دارالعلوم دیوبند سے ان کا لگاؤ فطری تھا، کیونکہ ان جدِّ امجد مولانا فضل الرحمنؒ اس کے بانیوں میں سے تھے۔

ان کی زندگی ان کے گوناگوں مشاغل سے معمور رہی، دارالعلوم دیوبند کے ان علماء میں شمار کیے جاتے جن پر بجا طور سے اس کو فخر ہو سکتا ہے، دیوبند اور ڈابھیل کے مدرسوں میں کچھ دنوں درس و افتاء کی خدمت انجام دی، پھر کلکتہ کی کولوٹولا اسٹریٹ کی بڑی مسجد کے خطیب رہے، جہاں اپنے درس قرآن سے بھی لوگوں کو مستفیض کیا، وہاں سے دہلی آکر ندوۃ المصنفین قائم کیا اور اسی کو حرزِ جاں بنا کر اپنی پوری زندگی گزار دی۔

سیاست میں بھی برابر حصّہ لیتے رہے، بڑے خوش بیان مقرر تھے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کے جاں باز سپاہی بنے تو اپنی وضع داری میں آخر وقت تک اس کے ساتھ رہے، مگر وہ ان کانگریسی مسلمان رہنماؤں میں نہ تھے جو ہندوؤں اور حکومت میں تو بہت محبوب سمجھے جاتے ہیں، لیکن اپنے ہم مذہبوں میں معتوب ہوتے ہیں، ان کا سیاسی ذہن بہت صاف تھا، اس لیے غیر کانگریسی رہنماؤں سے بھی ان کا میل ملاپ رہا، ان سے اپنے تعلقات کے آبگینے میں کسی قسم کی ٹھیس لگنے کو پسند نہ کرتے، اونچے خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس لیے خاندانی وراثت میں جو اوصاف پائے تھے، ان کو اپنی سیاسی زندگی میں بھی برقرار رکھا، اپنے معاصروں سے بہت ہی محبانہ طور پر ملتے، خواہ ان کا سیاسی مسلک کچھ بھی ہوتا، اپنے چھوٹوں سے مربیانہ انداز کی گفتگو کرکے ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دلوں کو موہ لیتے، اپنے نا قدروں بلکہ مخالفوں سے بھی شریفانہ برتاؤ رکھتے ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے مجلسِ مشاورت کے اربابِ حل وعقد نے ان کو اس کا صدر بنایا، تو آخر وقت تک وہ اس منصب پر قائم رہے، مگر ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمان کچھ ایسے غیر متحرک ہو گئے ہیں کہ ان کا جمود ختم ہوتا نظر نہیں آتا، اس لیے مجلس مشاورت میں بھی وہ حرکت پیدا نہ ہو سکی جس کی توقع کی جا سکتی تھی، اس کا افسوس عام مسلمانوں کے ساتھ خود مولانا ئے مرحوم کو بھی رہا۔

ان پر جہاں عام مسلمانوں کو اپنے ملی معاملات میں اعتماد رہا، وہاں حکومت ہند کو بھی ان کے وطنی جذبہ پر پورا بھروسہ رہا، ملک کے دینی مدرسوں، علمی انجمنوں، اور علمی تحریکوں میں ان کی رکنیت اور شمولیت باعث فخر سمجھی جاتی، اسی طرح حکومت کی بعض اہم کمیٹیوں کے بھی رکن رہے اور کبھی بیرونی وفود میں حکومت کی نمایندگی بھی کی، دینی علمی اور سیاسی مجلسوں میں اپنی خطیبانہ شان سے اثر انداز ہوتے، اور ان کے مخلصانہ مشوروں کی قدر کی جاتی۔

ان کا زندہ جاوید کارنامہ ندوۃ المصنفین ہے جس کی تاسیس انھوں نے ملک کے مشکل حالات اور اردو زبان کے صبر آزما ماحول میں ۱۹۳۸ء میں کی، اس وقت سے اب تک اس کی طرف سے تقریباً دو سو کتابیں، مذہب، تفسیر، حدیث، تاریخ، سیاست، اور دوسرے علوم وفنون پر دیدہ زیب کتابت و طباعت بڑی اچھی جلد اور گرد پوش سے شائع ہو چکی ہیں، ان سے اردو لٹریچر میں بڑا وزن اور وقار پیدا ہو گیا ہے، نشرو اشاعت کا ادارہ قائم کرنا اور اس کے معیار کو برقرار رکھ کر مقبولِ عوام و خواص بنانا صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا، مگر مولانا ئے مرحوم نے اس جوئے شیر کو رواں رکھنے میں اپنی پوری زندگی گذار دی، اردو کے علم و فن کی تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

وہ خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہیں ہوئے، انھوں نے شروع میں علامہ ابن تیمیہ کی الکلم الطیب پر تشریحی نوٹ لکھے، اور علامہ ابن جوزی کی صید الخاطر کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا، قرآن مجید کی مختصر تفسیر دو جلدوں میں لکھنی چاہتے تھے، لیکن لکھ نہ سکے، ان کی ریڈیائی تقریروں کا ایک مجموعہ "منارہ صدا" کے نام سے شائع ہوا ہے، وہ جیسی میٹھی گفتگو کرتے ویسی ہی میٹھی تحریر بھی لکھتے اپنے سیاسی مشاغل اور ندوۃ المصنفین کے اہتمام کے ترخشوں کی وجہ سے خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہ بن سکے، لیکن مصنف گر ضرور ہوئے، ان کے ادارہ کی وجہ سے بہت سے اہل قلم مصنف بن گئے اور ان کی دبی صلاحیتیں ابھریں، ورنہ یہ دبی رہ جاتیں تو علوم و فنون کا کتنا بڑا نقصان ہوتا۔

ندوۃ المصنفین کا ترجمان مجلہ برہان ہے، جو جولائی ۱۹۳۸ء سے اب تک ہر مہینہ بڑی پابندی سے نکل رہا ہے، اس کی قلمی گل کاریوں، ادبی زمزمہ سنجیوں، مذہبی موشگافیوں، علمی نکتہ آفرینیوں اور اس کے مختلف مضامین کی مشاطہ گری کی کاوشوں کا زرّیں سہرا تو مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے سر ضرور ہے لیکن اس کی کتابت، طباعت ٹھیک وقت پر اشاعت اور اس کے مالی ذرائع کی کمی کو پورا کرنے کی محنت و ریاضت کا جو نمونہ مولانائے مرحوم کے ذریعہ سے عمل میں آیا وہ عملی اور تعمیری سرگرمیوں کی ایک قابل تقلید مثال ہے۔

وہ اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، مگر جن لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے، یا ان سے ملنے جلنے کا موقع ملا، وہ ان کے کھلنسا ہٹ مرنجاں مرنج انداز طبع، اختلاف کے موقع پر شریفانہ برتاؤ، مسلمانوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاسی مصیبتوں کے وقت ان کے اندرونی مضطربانہ جذبات اور ان کے سیاسی مستقبل کو سنوارنے کی خاطر ان کے فکری رجحانات کو یاد کر کے دل سے دعائیں کریں گے، کہ ان کی زندگی کے روشن کارنامے اُن کے لیے توشۂ آخرت بنیں، اور وہ بارگاہ ایزدی میں کہہ رہے ہوں، ربّ اغفر وارحم وانت خیر الرّاحمین۔

پروفیسر
خلیق احمد نظامی
سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

نظامی ولا - علی گڑھ

۱۸ مئی سنہ ۱۹۸۲ء

عزیز مکرم، سلام مسنون

مفتی صاحب کے سانحۂ ارتحال سے بے حد رنج ہوا۔ اُن کے ساتھ ایک دور ختم ہو گیا۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ مجیب میاں کہاں ہیں؟ میں اُن کو بھی لکھنا چاہتا تھا لیکن اُن کا پتہ معلوم نہیں۔

جو خلا اس حادثہ سے ہماری قومی اور ملی زندگی میں پیدا ہو گیا اس کا پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔

مخلص
خلیق احمد نظامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ایک مثالی شخصیت ایک غیر معمولی انسان

(مولانا بدر الحسن قاسمی)

مفتی صاحب کی ذات مختلف جماعتوں کے درمیان ربط و اتحاد برقرار رکھنے کی ایک علامت تھی۔ اس لئے موجودہ حالات میں ان کا رخصت ہو جانا ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ ان کے چلے جانے سے نہ صرف عظمت و عبقریت کی بساط الٹ گئی ہے بلکہ اس انجمن کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہے جو ہر طرح کی گروہی عصبیتوں دینی اور سیاسی اختلافات اور جماعتی دھڑے بندیوں کے رجحان سے ماورا ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک اکائی سے منسلک رہنے اور مشترک مسائل کے حل کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کا سبق دیتی تھی۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ نے عمر کی ۸۳ بہاریں دیکھیں، ان کی پیدائش اس صدی کے بالکل آغاز میں ایک ایسے دینی و علمی خانوادہ میں ہوئی تھی جس کا برصغیر کی مذہبی و سیاسی تاریخ پہ بڑا گہرا چھاپ ہے۔ ان کے والد حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن ہند و پاک کے نامور فقیہ اور بلند پایہ مفتی تھے دار العلوم دیوبند میں مسند افتا انھیں کے دم سے قائم ہوا تھا۔ اور تقریباً نصف صدی تک ان کے فتووں کو سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل رہی۔ ان کا صرف ایک حصہ چودہ پندرہ جلدوں میں شائع ہوا ہے مفتی صاحب کے چچا شیخ الاسلام پاکستان حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے علمی مقام، شان خطابت اور تحریک پاکستان میں ان کے کارنامہ سے تو ایک دنیا آگاہ ہے ان کی تحریر کردہ صحیح مسلم شریف کی ضخیم عربی شرح فتح الملہم تمام علمی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہوں نے جس وقت آنکھ کھولی اس وقت برصغیر مختلف علم وفن کے ماہرین اور اکابر رجال سے کف گلفروش بنا ہوا تھا۔ تقریباً تمام مذہبی و سیاسی نامور ہستیوں کو دیکھنے کا انکو موقعہ ملا، ان کے نامور اساتذہ میں اپنے والد اور چچا کے علاوہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے اور آخر عمر تک انہوں نے اپنے آپکو علمی حیثیت سے ان کا ہی مرہون منت سمجھا اور ان کے وفا کیش رہے۔ ذکاوت وذہانت تو ان کا خاندانی جوہر تھا، چنانچہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں رہے کچھ عرصہ دینی و علمی کام کرنے کے بعد اپنے آپ کو سیاسی اور سماجی کاموں کے لیئے وقف کر دیا۔ انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، عطاء اللہ شاہ بخاری، علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ صحیح طور پر ان کے جانشین تھے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ سے بھی ان کا قریبی رشتہ رہا۔ اس لیئے ان کی ذات میں پورے ایک عہد کا خلاصہ جمع ہو گیا تھا۔ اور ان کی شخصیت بڑی متوازن بن گئی تھی انہوں نے اپنے زمانہ میں برپا ہونے والی تحریکات اور اشخاص کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا تھا اس لیئے ان کی رائے بڑی وقیع اور باوزن ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے جن نامور شخصیتوں کو دیکھا اور برتا تھا اور جن سے کسب فیض کیا تھا ان کا طبعی اثر ان کے مزاج پر یہ تھا کہ ان میں بے پناہ وسعت صدر، اور ہمہ نوازی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا ان کی ذات ایک سراپا انجمن تھی۔ اور ان کا دفتر ایک بین الجماعتی کانفرنس ہال، یونیورسٹی کے طلبا رہوں یا اساتذہ و منتظمین اور دینی وسیاسی جماعتوں کے سربراہ ہوں یا وزراء و ممبران پارلیمنٹ گذشتہ چند برسوں سے تو مختلف مسائل میں پیچیدگیوں کے حل کے لیے مفتی صاحب کا آفس ہی ان سبھوں کے لیئے پہلا ٹھکانہ تھا اور مفتی صاحب ایک عامی سے لے کر افسر تک سب کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باتیں یکساں توجہ سے سننے اور اپنی رائے سے نوازتے رہتے تھے۔

دہلی میں مختلف طبقوں میں ان سے زیادہ ادب و احترام سے کسی اور کو نہ دیکھا جاتا تھا اور نہ ان کی طرح مختلف دینی و اجتماعی کاموں کے لیئے اور مختلف کمیٹیوں میں شرکت کے لیئے کسی اور کو بلایا جاتا تھا مفتی صاحب کے پاس صرف مسلمان ہی نہیں دوسری قوم کے لوگ بھی اپنے مسائل حل کرانے کیلئے آیا کرتے تھے یہ ان کی ایسی ہر دلعزیزی تھی جس میں کوئی ان کا شریک نہیں تھا۔ اور جو ان کی بے انتہا تواضع اور وضعداری کے باعث ان کو حاصل ہوئی تھی۔

ان کو ہندوستان کی طرح پاکستان کی علمی و ادبی انجمنوں اور دینی حلقوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ انہوں نے سعودی عرب، انڈونیشیا، وسط ایشیا، اور بعض دوسرے ملکوں میں علمی و دینی کانفرنسوں میں بھی متعدد بار شرکت کی تھی۔ اور ہر جگہ اپنے علم و فضل کا اثر چھوڑ کر آئے۔

مفتی صاحب کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان سبھوں کو اجاگر کرنا تو مستقل کتاب کا موضوع ہو سکتا ہے یہاں تو محض ان کی زندگی کے چند نقوش ظاہر کیئے جا سکتے ہیں۔ وہ ایک عالم دین ایک مفکر، ایک سیاسی قائد اور ایک انسان کی حیثیت سے ایک پوری دُنیا اپنے اندر لبسائے ہوئے تھے۔ ان کی فقہی یا سیاسی آرا سے اتفاق ہو یا اختلاف ان کا اخلاص ہر شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ ہم جوئی یا انقلاب انگیزی ان کی طبیعت میں نہ تھی۔ ان میں تحمل، نرم خوئی اور مشکلات کا بے ضرر اور سنجیدہ حل تلاش کرنے کا رجحان غالب تھا۔ اس لیے ان کی باتوں سے پُرجوش لوگوں کو شکایت ہوتی تھی یا ان کے بارے میں سرد مہری کا خیال ہوتا تھا لیکن حالات کی تلخیوں نے انھیں بجائے اشتعال پیدا کرنے کے ان میں سمندر کی گہرائی اور سکون پیدا کر دیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خالص دینی اور قدیم طرز کی تعلیم کے باوجود ان کا میل جول چونکہ ہمیشہ نئے پڑھے لکھے طبقہ کے ساتھ بھی اسی طرح رہا جس طرح قدیم دینی حلقوں کے ساتھ اس لیے وہ نئی تبدیلیوں سے بھی بہت زیادہ آگاہ رہے اس لیے بعض فقہی مسائل میں بھی انکے یہاں توسع پسندی زیادہ تھی۔ گرچہ ان کی ذاتی زندگی خالص اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر رہی۔

سیاسی میدان میں ان کا رشتہ مختلف رُجحانات کے لوگوں سے رہا جس کی وجہ سے وسیع المشربی آجانا ایک طبعی بات تھی اور آزادی کے بعد خاص طور پر ہندوستان کے حالات بھی ایسے ہی رہے۔ کسی ایک رُخ پر زیادہ سختی سے جمنے کا موقع باقی نہیں رہ گیا تھا۔

سیاسی و اجتماعی کاموں میں الجھاؤ کے باوجود علمی و ادبی کاموں سے کبھی کنارہ کش نہیں ہوئے ۱۹۳۸ء میں انہوں نے عظیم علمی و ثقافتی ادارہ "ندوۃ المصنفین" کی اپنی چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بنیاد رکھی تھی۔ جس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا نام قابل ذکر ہے۔ اور علمی ماہنامہ بُرہان کا اجرا کیا ۴۷ء میں جب قتل و خونریزی کا بازار گرم ہوا، تو جان کے لالے پڑ گئے، ندوۃ المصنفین جو قرول باغ میں واقع تھا جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ کئی دن حیات و موت کی کشمکش میں گزارنے کے بعد جب خدا نے جان بچائی تو دیکھا کہ دنیا ہی بدلی ہوئی ہے محلے کے محلے ویران ہو گئے ہیں۔ ہر طرف کشتوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں۔ خاندانوں کے خاندان اس طرح تہ تیغ کر دیئے گئے ہیں کہ ان کا نام و نشان نہیں ملتا۔ ندوۃ المصنفین تو خیر مسلمانوں کے خون کے اس سیلاب کے درمیان ایک معمولی سی چیز تھی جو خاک کا ڈھیر بن گئی۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالات کچھ بدلے تو دوبارہ جامع مسجد دہلی سے قریب ندوۃ المصنفین کا آفس قائم کر دیا گیا اور انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں مفتی صاحب نے اسے تقریباً نصف صدی تک قائم رکھا اور ایسی کتابیں وہاں سے شائع ہوئیں جو عصر حاضر کی زبان اور ذوق و مزاج کے مطابق ہیں اور جن میں مغرب کی جدید ذہنی یورش سے مقابلہ کا پورا سامان موجود ہے۔ ماہنامہ برہان کا بھی وقار و اعتبار علمی حلقہ میں قائم رہا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مفتی صاحب کو قدرت نے اردو نثر لکھنے کا جتنا پاکیزہ ذوق دیا تھا۔ اور علمی حیثیت سے وہ جس پایہ کے آدمی تھے اس کے بالکل برعکس انھوں نے ہمیشہ دوسروں کو بڑھانے اور خود کو انشا پردازی کے میدان میں پیچھے رکھنے کی سعی کی اور شاذ و نادر ہی اور انتہائی مجبور کن حالات ہی میں کچھ لکھا۔ غالباً بعد کے سالوں میں انھوں نے صرف وہ مقالہ توجہ سے لکھا تھا جو اپنے استاد علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے متعلق سرینگر میں منعقد ہونے والے سمینار میں خود ہی پڑھ کر سنایا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہ انکی دقت نظر اور خالص فقہی و اصولی مسائل میں ان کی ژرف نگاہی کی بیّن دلیل ہے۔ ان کی اتفاقیہ لکھی ہوئی تحریروں کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ کاش ان کی ذہنی صلاحیت دوسرے خرخشوں میں الجھنے کے بجائے صرف علمی کاموں کے لئے وقف ہوتی۔ لیکن وہ اجتماعی کاموں میں ہی لذت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ وہ مصنف بننے کے بجائے مصنف گر ہی رہے۔ ندوۃ المصنفین کو ان کی خدمات جلیلہ کا شاہکار کہا جا سکتا ہے جس نے بہت سے نامور مصنفین کو زیادہ تر ان کی شخصیت کے وزن اور بے نفسی کی وجہ سے ان کے ساتھ مربوط کر دیا تھا۔ اور وہ کام ہو گیا جو بڑے سرمایہ سے بھی ہونا مشکل ہوتا ہے۔

۱۹۶۴ء میں بھیانک ہندو مسلم فسادات ہوئے جس نے مسلمانوں کے ذہن میں اسی طرح کی دہشت طاری کر دی جو ۱۹۴۷ء میں پیدا ہو گئی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی پس منظر تھا جس میں آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت قیام عمل میں آیا۔ اور فسادزدہ علاقوں کا دورہ شروع کیا گیا۔ ڈاکٹر سید محمود مرحوم کے ساتھ اس مہم میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا ابواللیث اصلاحی وغیرہ تھے۔ جس کا خوش گوار اثر ہوا۔ اور سید محمود صاحب کے بعد مفتی صاحب ہی اس کے صدر قرار پائے۔ بعد میں مجلس زیادہ طاقت ور کبھی نہیں ہوئی۔ جس کی وجہ حضرت مفتی صاحب کی نرم خوئی اور مختلف زعمائے ملت جن کے اشتراک سے مسلم مجلس مشاورت کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ ان کی اپنی جماعتی اور ذاتی مصالح ہیں لیکن نام کی حد تک مسلمانوں کے ایک فورم کی حیثیت سے مفتی صاحب نے اس کا ڈھانچہ قائم رکھا۔ جو سنگین حالات میں مسلم لیڈروں کو یکجا کرنے کا ایک عنوان بنا رہا مفتی صاحب میں قائدانہ طنطنہ نہیں تھا یا دوسرے لفظوں میں مفتی صاحب اپنے آپ کو توڑ جوڑ کی اس سطح پر لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ جس کے دم پر لیڈروں کی لیڈری اس وقت قائم ہے۔ اور غالباً مفتی صاحب کی عظمت کا راز اسی میں پنہاں ہے۔ انہوں نے کبھی اپنی شخصیت پر مصنوعی خول چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ دل اور زبان کا رشتہ انکے یہاں کبھی منقطع ہونے نہیں پایا۔ انہوں نے جو کچھ سوچا اسکا اظہار کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور کیا۔ زخم کھانے اور شکست قبول کرنے کی ان کو گویا عادت سی ہو گئی تھی اس لئے انہوں نے ہمیشہ سخت سے سخت موقف کو صبر و تحمل سے انگیز کیا۔ لیکن کبھی کسی سے آویزش مول نہیں لی۔ بھونکنے والوں کو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا تیر اندازی کرنے والے بھی جب ان کے سامنے آتے ان کو سینہ سے لگا لیا۔ ظاہر ہے کہ اس درجہ کا تحمل جہاں ایک طرف انتہائی اخلاقی کمال ہے وہیں دیکھنے والوں کی نظر میں ہمیشہ ایک طرح کی کمزوری کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لیکن مفتی صاحب کو کبھی اس کی پرواہ نہیں ہوئی۔

مفتی صاحب کے خانگی احوال ان کے لئے مستقبل سوہان روح تھے لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سالہا سال ساتھ بیٹھنے والوں نے کبھی ان سے ایک حرف شکایت بھی نہیں سنا۔ اچھے اچھے باعزیمت لوگوں کو یہ کہتے سنا کہ اگر کوئی دوسرا ان کی جگہ پہ ہوتا تو ذہنی توازن کھو بیٹھتا۔ گویا انہوں نے ہر حال میں نباہ کیا زندگی کے ساتھ نہ کبھی تقدیر کا ماتم کیا اور نہ لوگوں کے ظلم و ستم کا گلہ۔

آخری عمر میں ان کو واسطہ کچھ ایسے لوگوں سے پڑا۔ جو بہت چھوٹے ہیں اور اپنے اندر بعض غیر انسانی اوصاف رکھنے کے باوجود خود کو عصر حاضر کی نامور روحانی شخصیات کی شکل میں پیش کرنے کا ڈرامہ کھیل رہے ہیں۔ دھوکہ اور فریب کی کوئی راہ ایسی نہ تھی۔ جو ان لوگوں نے نہ اپنائی ہو۔ مفتی صاحب سارا کھیل حیرت کی نگاہوں سے دیکھتے رہے کبھی نہایت ظریفانہ انداز میں فرماتے "میاں پیشہ ور مجرموں سے تو بچا جا سکتا ہے لیکن تہجد گزار مجرموں سے کس طرح آدمی اپنے آپ کو بچائے۔"

اس سے زیادہ بڑا ناسور ان کے لیئے یہ تھا کہ ان کے ان ساتھیوں نے جو درحقیقت انہیں کے ساختہ و پرداختہ تھے اور جن کے ساتھ زندگی بھر کے لئے اپنے آپ کو مٹا کر پیمان وفا باندھا تھا انہوں نے بھی انھیں آنکھیں دکھلانی شروع کیں۔ اور معمولی منفعت کی خاطر عمر بھر کی دوستی و تعاون کا بھی پاس و لحاظ نہیں رکھا۔ اس صورتحال نے ان پر بالکل وہی کیفیت طاری کر دی تھی جس کا اظہار کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

ذھب الذین یعاش فی أکنافھم ۔ و بقیت فی خلف کجلد الأجرب

یعنی وہ لوگ جن کی آغوش میں زندگی گزاری جا سکتی ہے وہ سب رخت سفر باندھ چکے اور میں تنہا خارشتی اونٹ کی کھال کی طرح پیچھے رہ گیا ہوں۔ (چنانچہ نہ زندگی ہی کا لطف ہے اور نہ موت ہی اپنے وقت سے پہلے آ سکتی ہے۔)

درحقیقت واقعہ یہ ہے کہ درویش کے لباس میں مکروفریب کا حربہ جتنی کامیابی سے اپنایا جا سکتا ہے کسی اور رنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس راز کو عصر حاضر کی بعض مثالی شخصیتوں نے پالیا تھا جن کو اپنے بارے میں تواضع کے سارے مظاہر اختیار کرنے کے باوجود کائنات کا عطر ہونے کا احساس ہمہ وقت طاری رہتا ہے۔ تقویٰ کی ہر دم رٹ، موقع کے لحاظ سے آنسو بہانے پر قدرت تحریروں میں مناظرانہ پختگی لیکن جب کبھی کسی اجتماعی معاملہ میں ''انا'' کو ذرا ٹھیس لگنے ہیبت کا ظہور اس شدت سے ہونے لگتا ہے کہ بے حیائی کو بھی حیا آنے لگتی ہے۔

مفتی صاحب کو اس طرح کی فنکاری سے سخت نفرت تھی، چنانچہ برملا تنقید فرماتے تھے اور نہایت لطیف پیرائے میں خود مفتی صاحب کا اپنا حال یہ تھا کہ گالیاں سن رہے ہیں اذیتیں سہہ رہے ہیں نقصانات برداشت کر رہے ہیں لیکن اُف تک زبان پر نہیں ہے لیکن اس درجہ کے تحمل کے لیے بڑا دل گردہ چاہیئے۔ خاص طور پر رفقاء واحباب کی بے وفائیوں کو سہنا تو بڑا صبر آزما کام ہوتا ہے لیکن مفتی صاحب انتہائی حساس دل اور غیر معمولی ذکاوت رکھنے کے باوجود برداشت کی غیر معمولی قوت بھی رکھتے تھے۔

ان کی ایک عجیب وغریب ادا ان کی بے انتہا تواضع تھی۔ اپنے چھوٹوں کے سامنے بھی وہ اس طرح بچھ جاتے تھے کہ شرمندگی ہوتی تھی۔ بڑی محبت سے ہر ایک سے ملتے سب کا دکھ درد سنتے اپنی استطاعت کی حد تک پریشانی دور کرنے میں کوشاں ہوتے۔ گھر میں ہوں یا کسی اجتماع میں یا سر راہ ان کی وضعداری اور محبت میں کبھی فرق محسوس نہیں ہوتا تھا یہ انکی شخصیت کا بڑا کمال تھا۔ ان کے یہاں اپنے اور غیر کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ ساری دنیا ان کی اپنی تھی۔ غیر کوئی نہیں تھا۔

خدا نے ان کو جتنا زرخیز دماغ، جیسی دور اندیشی اور حکمت، بولنے اور لکھنے کی جیسی صلاحیت اور لوگوں میں جس طرح کی مقبولیت دی تھی اور خود اپنے والد اور دوسرے بزرگوں تک کے ماننے والوں کا جیسا حلقہ دیا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے لیئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دنیوی عیش و راحت کا بہت کچھ سامان کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ہمیشہ اسے ایک خُرد تربات سمجھا اور ساری عمر کسٹوڈین کی طرف سے کرایہ پر ملنے والے ایک معمولی سے مکان میں گزاری جبکہ ان کے سامنے پیدا ہونے والے ان کے ساتھ ناروا معاملہ کرنے اور طرح طرح سے ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کی سعی کرنے والوں نے دیکھتے ہی دیکھتے عالی شان محلات تعمیر کر لیے۔ نقوی کی دوکان آباد کر لی قوم کا سارا سرمایہ اپنی حیثیت منوانے کے لیئے وقف کر لیا اور پھر بھی رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

مفتی صاحب کا ایک بڑا وصف ان کی غیر معمولی امانت داری تھی۔ صرف انہیں کی ذات ہم نے ایسی دیکھی کہ بڑی سے بڑی رقم بطور امانت رکھنے کے بعد سالہا سال گزرنے پر بھی اگر واپس کی جائیں تو وہی رکھے ہوئے نوٹ اور اسی لفافہ میں سب کی امانتیں نام بنام الگ الگ اس زمانہ میں یقیناً یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

یوں تو ان کی صحت کافی عرصہ سے مضمحل چل رہی تھی۔ لیکن مشاورت کا اجلاس ہو۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلما کی مجلس شوریٰ ہو مسلم پرسنل لا بورڈ کی میٹنگیں ہوں پابندی اور اپنی شخصیت کے پورے وزن کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ اور ظریفانہ ایک دو جملوں میں جلسہ کا رُخ موڑ دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی کاٹ سے سبھی گھبراتے تھے۔ خاص طور پر کم و بیش ان کی جیسی ہی عمر رکھنے والے لوگ۔ دو سال قبل اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ایک عالمی سیمینار منعقد کیا گیا وہ اپنی کمزوری کے باوجود مولانا علی میاں صاحب کی دعوت پر تشریف لے گئے واپسی میں فالج کا حملہ ہوا علاج کے بعد حالت بہتر ہو گئی تھی۔ اور چلنے پھرنے بھی لگے تھے کہ ۱۲ مئی کو خدا کی رحمت نے آغوش میں لے لیا اور جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اس طرح پون صدی کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا خدا ان کی مغفرت فرمائے اور صالحین کے زمرہ میں ان کا حشر فرمائے۔ آمین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقشِ اوّل

ماہنامہ طیب دیوبند

مفکرِ ملّت حضرت مفتی عتیق الرّحمٰن عثمانی رح

دوسال کی طویل علالت کے بعد بالآخر مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بانی ندوۃ المصنفین دہلی و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند اپنے ربِّ حقیقی سے جا ملے، نور اللہ مرقدہٗ و رفع درجاتہٗ۔

دوسال قبل حضرت مفتی صاحب رح پر فالج کا حملہ ہوا تھا، عمر کی نویں دہائی میں بھی ضعف کے باوجود اس مرض کا مقابلہ کرتے رہے، اسی اثنار میں ان کو موذی مرض کینسر بھی لاحق ہو گیا جس سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ سخت ترین مرض کے باوجود بھی ان کا ذہن کبھی ذہول کا شکار نہیں ہوا۔ بستر علالت پر پڑے رہے لیکن اس دوران ان کے فکر و ذہن میں وہی صلاحیت برقرار رہی جس کے لیے وہ معروف تھے۔

دیوبند میں عثمانی خاندان کی ایک عظمت ہے، اس خاندان کے علمی کارنامے ہیں، مفتی صاحب ملکی اور ملی خدمات کے امین اس عثمانی خاندان کے چشم و چراغ تھے جن میں نمایاں ترین شخصیتیں گذری ہیں، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رح حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رح سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے برادر حقیقی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رح کے فرزند، علمی ماحول میں پرورش پائی اور یگانۂ روزگار محدثِ عصر مولانا انور شاہ کشمیری سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت مفتی صاحب خداداد ذہانت اور اعلیٰ صلاحیت کے مالک تھے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی صدارت بیشتر آپ ہی فرماتے تھے۔ طبیعت میں اعتدال۔ رائے میں توازن، فکر میں گہرائی، اور معاملات میں دوراندیشی آپ کا طرۂ امتیاز تھی۔ موقع پرستی کی سیاست سے دور، حصولِ اقتدار کے لیے ضمیر فروشی سے بیزار اور ذاتی مفاد کے لیے ملّت کا سودا کرنے کی لعنت سے آپ ہمیشہ پاک وصاف رہے۔

صبر و قرار ہے نہ حواس اور ہوش ہے
اب زندگی میں کوئی حرارت، نہ جوش ہے
دنیا سے وہ مفکرِ ملّت چلا گیا
ہر شخص جس کے واسطے ماتم بدوش ہے
داغِ فراق و صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مفتی صاحب صبر و استقامت کا پہاڑ اور اپنے عزم و ارادہ کے انتہائی پختہ مردِ آہن تھے، حالات نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں۔ ملک کی سیاست میں کئی انقلاب آئے۔ دارالعلوم دیوبند بھی تہ و بالا ہوا لیکن حضرت مفتی صاحب کو اپنی جگہ سے کوئی بھی نہ ہلا سکا۔ انھوں نے پہلے دن جو موقف اختیار کیا تھا آخر تک اسی پر قائم رہے۔

حضرت مفتی صاحب اپنی وضع کے پابند۔ اخلاق و شرافت کا مجسّمہ اور علم و حلم کا پیکر تھے ان کی وفات پر ملّی سیاست اور دینی قیادت کو جو زخمِ عظیم لگا ہے اور عظیم خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دارالعلوم دیوبند کے وہ فاضل باکمال کہ اب ہند و پاک میں جن کا کوئی ثانی نہیں؛ دیوبند کے علوم و نظریات، اس کی تہذیب و شائستگی اور شرافت و وضعداری کی آخری یادگار، حلم و بردباری اور حق شناسی و حق گوئی کے خوگر، خورد نوازی، اعتدال پسندی، اور مسلمانوں کی ہر جماعت کو ساتھ لے کر چلنے کی مشکل ترین روش کے حامل، قدیم افکار و علوم اور روایات صالحہ کے پیکر، جدید مسائل اور نئی نسل کے لیے رہنما، علوم و معارف کے دریائے بیکراں، تقریر و تحریر کے ماہر، لطیف اندازِ گفتگو کے باوجود مشکل ترین معاملات کو حل کرنے کی صلاحیت رکھنے والی عظیم شخصیت۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد حضرت مفتی صاحب اپنے استاذ علامہ کشمیری کے ساتھ ڈابھیل چلے گئے۔ ایک عرصہ تک ان سے استفادہ کیا پھر کچھ عرصہ کلکتہ میں گذارنے کے بعد مستقل طور پر دہلی میں جم گئے۔ تقسیم ہند سے قبل ہی انھوں نے ممتاز فضلائے دارالعلوم پر مشتمل ایک علمی ادارہ کی تشکیل دی، قرول باغ دہلی میں ندوۃ المصنفین کا باضابطہ دفتر تھا اپنی لائبریری تھی، ابھی اس ادارہ نے علمی میدان میں ارباب علم و دانش کی نظریں اپنی طرف متوجہ کی ہی تھیں کہ ۱۹۴۷ء کا وہ خونیں دور آیا جس میں ندوۃ المصنفین کی عمارت جل گئی اور اس کا سارا سرمایہ لٹ گیا، ان کا وہ آشیانہ ہی اجڑ گیا جس کو انھوں نے بڑی جدوجہد اور تگ و دو کے بعد بنایا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد پھر تنکا تنکا جمع کرکے اپنے آشیاں کی تعمیر میں لگے رہے۔ ندوۃ المصنفین کے لیے ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی پیش کش مالی تعاون کو بھی مسترد کر دیا اور ارباب حکومت کے دلوں میں اس کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا کہ جو اکابرین اور پیش رو علماء کی مثال رہی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجودہ نصف صدی میں ہندوستان میں قائم ہونے والے تصنیفی اور تحقیقی اداروں میں ندوۃ المصنفین دہلی اور دار المصنفین اعظم گڈھ یہی دو ادارے ایسے ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں خالص علمی اور تحقیقی کتابوں کا عظیم ذخیرہ مسلمانوں کو دیا۔ چنانچہ ندوۃ المصنفین حضرت مفتی صاحب کی وہ عظیم خدمت ہے جو ان کے علم وکمال کا بین ثبوت ہے۔

نہ صرف یہ کہ حضرت مفتی صاحبؒ علمی اور تصنیفی امور میں منہمک رہے بلکہ ملک وملّت کی ہر خدمت انجام دیتے رہے۔ جنگ آزادی کے مرد مجاہد بنے توجمعیۃ علمائے ہند کے سرگرم رکن رہ کر مسلمانوں کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔ مسلم مجلس مشاورت کے صدر، مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رہنما ممبر اور نہ جانے کتنے اداروں کے رہبر رہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ بحیثیت صدر مسلم مجلس مشاورت تمام مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو ایک پلیٹ فارم پر جوڑے رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کی ہی وہ مابہ الامتیاز خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ہر جماعت اور تنظیم مفتی صاحبؒ کی رائے اور ان کے مشوروں کو بڑی حیثیت دیتی تھی اور ہر حلقہ میں وہ احترام وعقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ اور مفکر ملّت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ دونوں حضرات اپنی گوناگوں خصوصیات اور علمی، دینی وملی خدمات کی وجہ سے برصغیر میں تمام مسلمانوں کے مقتدا اور پیشوا مانے جاتے تھے۔ یکے بعد دیگرے دونوں اہم شخصیتوں کے انتقال سے ملّت اسلامیہ کے حلقوں میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا۔

یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ حضرت مفتی صاحبؒ کا انتقال ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو دوپہر میں ہوا، دیوبند میں اس کی اطلاع فون کے ذریعہ ۴ بجے تک پہونچ گئی تھی۔ فوری طور پر دارالعلوم جامع مسجد سے اعلان نشر کیا گیا، لیکن افسوس کہ دارالعلوم دیوبند سے رات بھر تک کوئی اعلان نہیں ہوا، پھر نہ جانے کسی مصلحت سے دوسرے دن ۹ بجے دارالعلوم کے لاؤڈ اسپیکر سے انتقال کی خبر نشر کی گئی اور نصف یوم کی تعطیل کی گئی۔ حالانکہ حضرت مفتی صاحب مرحوم اخیر عمر تک دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ و عاملہ کے اہم رکن رہے جس مجلس کو موجودہ انتظامیہ ہیئت حاکمہ بھی تسلیم کرتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے علم سیاست اور ملک و قوم کی جو طویل بے لوث خدمت انجام دی اس پر یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ نصیب فرمائے گا۔

A CONDOLENCE MESSAGE FROM DR FAROOQ ABDULLAH CHIEF MINISTER JAMMU & KASHMIR

...

I AM GRIEVED TO HEAR ABOUT THE SAD PASSING AWAY OF MUFTI ATIQUL REHMAN SAHIB WHO WILL BE REMEBERED FOR HIS CONTRIBUTION TO ISLAM (.) HE WAS A VETERAN SCHOLAR AND AN OUTSTANDING PUBLIC FIGURE (.) ON BEHALF OF THE PEOPLE OF JAMMU & KASHMIR KINDLY ACCEPT MY DEEP CONDOLENCES (.)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Atiqur Rahman Usmani (1901-1984)

Islamic Scholar, Nationalist, Unifier of Men, Synthesizer of Ideas

MUSLIM INDIA JUNE 1984

Born in 1901, Atiqur Rahman Usmani, popularly known as Mufti Saheb, came from an eminent family of Ulema. His father Mufti Maulana Azizur Rahman Usmani was an eminent Mufti who had pronounced more than 1,18,000 Fatwas and was associated with the Darul-Uloom, Deoband. His grand-father was one of founders of the Darul-Uloom.

Mufti Saheb studied at the Darul Uloom and became Hafiz at the age of 9. He graduated at the age of 22 and initially taught at Deoband and then at Madrasa Islamia, Dhabel, Gujarat, for five years. From 1933-37 he was Khatib, Coolotola Mosque at Calcutta and during this period he came close to Maulana Abul Kalam Azad. In 1938 he shifted to Delhi and set up Nadwatul Musannefeen, an institution for Islamic research and publication which he served to his end. During this period, he translated into Urdu, with explanatory notes, Ibne Taimia's al-Kalam al-Tayyab and Ibne Jozi's Sadratul Khatir. He also began publishing the monthly journal 'Burhan' which has by now achieved a position of eminence in the Sub-continent.

Nationalist and Freedom Fighter

In 1930, he came into contact with Gandhiji during his Dandi March, and gave the famous Fatwa declaring 'haraam' the auction-purchase of properties confiscated by the British for violation of the Salt Act. Mufti Saheb identified himself with the Freedom Movement and the Indian National Congress and was associated with Jamiat-Ul-Ulema-i-Hind. Though his own uncle Maulana Shabbir Ahmad Usmani supported the Pakistan movement and left Jamiat, Mufti Saheb maintained his association and emerged as one of its leaders. After Independence, he became a close collaborator of Maulana Hifzur Rahman and subsequently served as the Working President of the Jamiat after the demise of Maulana Ahmad Sayeed who had succeeded Maulana Hussain Ahmad Madni. When Jamiat faced internal bickering, Mufti Saheb preferred to dis-associate himself in 1963 rather then take part in the factional fight.

In 1964, along with Dr. Syed Mahmood he founded the All India Muslim Majlis-e-Mushawarat. Later he succeeded Dr. Faridi as its President.

A Pillar of Secularism

In 1947, Mufti Saheb was himself a victim of the communal disturbance and had to shift from Karol Bagh and take refuge in Gali Katra Nizamul Mulk near Jama Masjid. Yet, there was not the slightest trace of bitterness in him and he continued to struggle against communalism whatever its religious label.

Mufti Saheb was equally at home in the company of scholars and of politicians and equally acceptable among the modern intelligensia and the orthodox Ulema. Even in the political field he enjoyed the confidence of all political parties. In his own characteristic way, Mufti Saheb served as a bridge between generations and as the confluence of many streams of thoughts, religious as well as political. Mufti Saheb never permitted personal relations to be overshadowed by political considerations, never used strong language against his worst detractors and treated even those who differed with him with consideration and affection. His genuis lay in the capacity for synthesis, for reconciliation and for finding areas of agreement.

A man of keen perception and high intelligence, Mufti Saheb went to the heart of a problem, cutting a difficult knot in one stroke and produced a solution acceptable to all concerned. This helped him in

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

keeping the Muslim Majlis-e-Mushawarat alive.

In his political thinking Mufti Saheb was essentially a nationalist and a moderate in tone and style. His nationalism not only stood for equality of all citizens but also for respect to the identity of all social groups which composed the nation. His main object in the post-partition period when he pursued as a close-associate of Maulana Hifzur Rahman was to ensure for the Muslim community a place of dignity in the council of the nation.

Mufti Saheb was associated with practically all Muslim institutions in the country. He was a life-long member of the Majlis-e-Shoora of the Darul Uloom, Deoband, as well as Nadwatul Ulema, Lucknow and Darul-Musannefeen, Azamgarh. He served as member of the Aligarh Muslim University Court and always took keen interest in its affairs. Jamia Millia Islamia and other Muslim educational, cultural and religious institutions in Delhi sought his guidance and patronage.

He was one of the founder members of the All India Muslim Personal Law Board and served as its Vice-President.

From its inception he was a member of the Central Wakf Council and on several occasions served as a member of the Haj Committee, Bombay, as well as of the Central Haj Advisory Board.

He had life-long interest in the promotion of Urdu language and literature and associated himself with Anjuman Taraqqi-e-Urdu and with several other Urdu organisations in Delhi.

Mufti Saheb represented the Waliullah tradition and quietly encouraged every initiative towards 'ijtihad' in order to find solution to the problems and dilemmas thrown up by the process of modernisation, in the light of the Quran and the Sunnah. He was one of the founder members of the Islam and Modern Age Society founded by Dr. Abid Hussain as well as of the Indian Institute of Islamic Studies, founded by Hakim Abdul Hamid. He also patronised such initiatives as the Baitul Hikmat, an organisation set up by Muslim scientists and intellectuals in Delhi. Mufti Saheb's greatness lies in making a clear distinction between the essentials of Islam and its superficial manifestations. In his personal life he was an orthodox Muslim but never judged anyone on the basis of the degree of his adherence to orthodox norms. In his social life Mufti Saheb was approachable and affectionate to all and had a kind word of encouragement and sympathy for anyone who had had an original thought and came up with a new idea.

Foreign Travel

In his later years Mufti Saheb visited many countries. Apart from Haj, he visited Saudi Arabia as well as Pakistan and other countries to attend International Conferences sponsored by Rabita al-Alam-al-Islami, Makka, Motamar al-Alam al-Islami, Karachi, and other organisations. He attended the Afro-Asian Islamic Conference in Jakarta as a representative of the Goveroment of India. He also participated in many academic seminars and symposia in India and abroad. On his visit to the USSR he studied the status of the Muslims of Central Asia particularly in relation to cultural and educational development.

In his speech and writing Mufti Saheb reflected the balance, moderation and precision of his personality. His speech and writing were equally marked by felicity of diction, command of subject-matter, logical arrangement of ideas, brevity, wit and by the spirit of universalism. A collection of his radio speeches has been published.

Last Days

About three years ago, while returning from the International Seminar of Orientalists organised by Darul Musannefeen, Azamgarh, he suffered a paralytic stroke. He never fully recovered from it but retained his memory, intelligence and interest, right upto his end. From his sick bed he directed the affairs of the Mushawarat and other institutions associated with him. Many of his friends and admirers who saw him during this period could not restrain their tears but Mufti Saheb never showed pain, never complained. So resigned was he to the will of Allah!

A few months before his death a swelling in his nose was diagnosed as malignant cancer. It spread rapidly and he passed away on the 12th May, 1984 and was buried in Qabristan Mehdiyan, near the grave of Shah Waliullah.

Last of the great nationalist Ulema thrown up by the Freedom Movement, Mufti Saheb's passing away is indeed the end of an era and leaves an irreparable void. May he rest in eternal peace! — Editor

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سماحة المفتي عتيق الرحمن العثماني

في ذمة الله

بدر الحسن القاسمي

فقد العالم الاسلامي بتاريخ ١٣-٥-١٩٨٤م علما بارزا وشخصية إسلامية كبيرة حيث توفي في دلهي سماحة المفتي عتيق الرحمن العثماني عن عمر يناهز الثالثة والثمانين ، وقد كان رئيس المجلس الاسلامي لعموم الهند ونائب رئيس هيئة الاحوال الشخصية للمسلمين وامين عام ندوة المصنفين ومن الاعضاء البارزين في عشرات من المجالس العلمية للجامعات والمجامع العلمية والثقافية . وعاش حياة حافلة بالخيرات العلمية والاجتماعية والسياسية ، والحديث عنه حديث عن عصر كامل وعن شخصية مثالية تترك آثارها في النواحي الفكرية والسياسية المختلفة .

كان العثماني سليل كرام بررة ، اسرته اسرة علم وفضل ودين وصلاح ، فكان ابوه الشيخ عزيز الرحمن العثماني من كبار الفقهاء والعلماء الربانيين ، وعمه هو المحدث الفذ النابغة شبير احمد العثماني الذي عرف بشيخ الاسلام في باكستان وكتابه « فتح الملهم بشرح صحيح الامام مسلم » اشهر من نار على علم ، ومساهمته في انشاء باكستان ثم تدوين دستور اسلامي له والدعوة الى تطبيق الشريعة الاسلامية فيه معروفة

ولد الشيخ العثماني في ديوبند حيث كان ابوه رئيس هيئة الافتاء في جامعتها واكمل الدراسة فيها وتخرج على ايدي النوابغ والاعلام وكان من ابرز اساتذته المحدث الكبير الشيخ محمد انور شاه الكشميري الذي اعتبر حقا استاذ الجيل في علم الحديث الشريف ، وعمه العلامة شبير احمد الذي كان من ابرز قادة رابطة المسلمين ومن خطبائها المفوهين وكان قد هاجر الى باكستان بعد نشأتها .

نبغ الشيخ عتيق الرحمن العثماني وكان حاد الذكاء دقيق النظر غزير العلم اشتغل فترة وجيزة في تدريس علوم الكتاب والسنة ثم انقطع للاعمال الاجتماعية والسياسية ، وشارك في حرب استقلال الهند وجاهد لحقوق المسلمين .

ومن مفاخر اعماله انشائه مع بعض زملائه مجمعا علميا باسم « ندوة المصنفين » في عام ١٩٣٨م ، وقد اصدر هذا المجمع العلمي ما

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

يزيد عن مائة وخمسين كتابا تعالج القضايا الفكرية المعاصرة و تدافع عن الاسلام و توضح معالم الحضارة الاسلامية وفضلها على الحضارة الغربية ، وتعتبر خير عدة للباحث فى مواجهة الغزو الثقافى الجديد .

وكل ذلك فى صمت واخلاص وبامكانية مالية زهيدة و مازالت مجلة ندوة المصنفين " برهان" احدى المجلات العلمية الراقية

وفى عام ١٩٤٧ و فى اعقاب استقلال الهند حينما انفجرت مجازر دموية رهيبة فى دلهى فكان الشيخ وزملاؤه رغم كل تضحياتهم فى حرب الاستقلال بين المتضررين فقد احرقت جميع كتب ندوة المصنفين ونهبت سائر ممتلكاتها و تحولت بنايتها الى الى كومة من رماد ، ولولا فضل الله وعنايته لكان الشيخ وزملاؤه بين القتلى حيث كان يطاف من الهندوس الحاقدين من منزل الى منزل . ولم يفقد الشيخ عزيمته ففتح مكتب "ندوة المصنفين" فى مكان آخر قرب المسجد الجامع واستمر فى العمل الى ان لفظ انفاسه الاخيرة .

وفى عام ١٩٦٤ حينما حدث مقتل رهيب يذهل كل عاقل ، وقتل من الرجال و النساء و الاطفال من لا يحصيهم الا الله حتى شعر بعض زعماء الهندوس ايضا بالاشمئزاز لهول المنظر وبشاعة اساليب التقتيل وتمثيل الجثث وكاد ان يغلب على المسلمين الاحباط النفسى قام الشيخ عتيق الرحمن العثمانى مع زملائه الآخرين ، ومن بينهم السيد محمود والشيخ ابو الحسن الندوى ، والشيخ ابو الليث الاصلاحى بانشاء المجلس الاستشارى لمسلمى عموم الهند ، وبدأت جولة تاريخية فى الاماكن المتضررة وكانت لها آثار طيبة فى نفوس المسلمين المنكوبين و رفع معنوياتهم ، ومنذ سنوات كان الشيخ المفتى عتيق الرحمن العثمانى هو رئيس المجلس الاستشارى بالاجماع بين القادة و الزعماء لما كان يتمتع به من اوصاف خلقية عالية .

مات الراحل العظيم ورثى الاوساط الدينية والسياسية تذكر مدة طويلة خصائص شخصيته العلامة شمائله التى تكاد تكون منفردة فقد عرف بكونه شخصا سالما جم التواضع ، رزينا ، حليما ، كبير العقل حاضر البديهة ، شديد الحرص على توحيد الصف وجمع كلمة المسلمين ، وقلما حظى احد باحترام مثله بين الفئات المتحاربة المتناقضة ، فقد كان مجلسه يجمع الوزراء و العلماء و رجال الفكر و الصحفيين والشعراء من المسلمين وغيرهم وهو يقابل الجميع بالتواضع والابتسام .

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ومنذ سنوات كان متفرغاً للاستماع الى مشاكل الناس والسعي لحلها ضمن طلاب الجامعات الى المتضررين في الاضطرابات الى رؤساء الجماعات الدينية الى اعضاء البرلمان ووزراء البرلمان كل يرى حل معضلته عند المفتي عتيق الرحمن العثماني وهو يستمع الى هذا وذاك دون كلل او ملل ليعمل ما يستطيع.

وفي الندوات والاجتماعات كل كان يتهيب لحضور بديهته ومقدرته على ادارة الاجتماعات وردءه للتحكم على القضايا المثارة، والذين يعرفونه عن كثب يشهدون له بالامانة والتواضع وانكار الذات فكان الانسان يسترد من عنده نفس النقود التي اودعها مع الظرف الذي وضعها فيه ولو بلغت مئات الالوف ومرت عشرات السنين وكان يقابل من هو دونه ويحييه في العمر باحترام وتواضع.

لولا بدائع صنع الله ما نبتت تلك الفضائل في لحم ولا عصب

وبموته انتهى الملتقى الذي كان يجمع في دلهي كل القيادات الاسلامية فقد كان مكتبه بمثابة ديوانية يرتادها امراء الجماعات الاسلامية و رؤساء الجامعات الدينية والعصرية ورجال ينتمون الى فئات واحزاب مختلفة، فا

فالى الجميع نعي الفقيد العظيم ونسأل الله سبحانه ان يتغمده برحمته ويمطر عليه شآبيب رحمته ورضوانه ويعوض الأمة بامثاله، وما ذلك على الله بعزيز.

००

श्याम लाल यादव
उपसभापति
राज्य सभा

दूरभाष : कार्यालय : 381171
निवास : 376455

कार्यालय : 32, संसद भवन
नई दिल्ली

निवास : 4, अकबर रोड
नई दिल्ली

जून 20, 1984

मुझे यह जानकर बेहद सदमा पहुँचा कि मौलाना मुफ्ती अतीकुर्रहमान उस्मानी का विसाल हो गया। वे हिन्दुस्तान ही नहीं दुनिया के जाने माने आलमेदीन थे और वे हिन्दुस्तान की शान थे। उनके इन्तकाल से जो नुकसान हुआ है उसे पूरा करना मुश्किल है। मैं दिल्ली से बाहर था इसलिये अपनी ताजीयत पेश करने में देरी हुयी।

आपका

(श्याम लाल यादव)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صاحبؒ کی کہانی

مولانا سعید احمد اکبرآبادی (مرحوم) کی زبانی

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سے میری پہلی ملاقات تو اس وقت ہوئی جب میں طالب علمی کی غرض سے دیوبند حاضر ہوا۔ لیکن مفتی صاحب کے خاندان سے میرے خاندان کے تعلّقات اور روابط میری پیدائش (۱۹۰۸ء) سے بھی پہلے سے تھے) اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحئی صاحب اور ان کے پھوپھا حافظ سید عنایت حسین صاحب یہ دونوں سرکاری ملازمت میں ہونے کے ناطے آگرہ میں، مع متعلقین کے رہتے تھے اور والد صاحب قبلہ کے ان دونوں بزرگوں سے بڑے گہرے مراسم تھے، ان کے اہلِ خانہ ہمارے گھر آتے اور میری والدہ ماجدہ ہم دونوں بہن بھائیوں کو لے کر ان کے گھر جاتیں، اور بعض مرتبہ دو دو تین تین دن قیام رہتا۔ اور ہاں یاد آیا، مفتی صاحب کے ایک اور پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق تھے، وہ بھی آگرہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ نہر تھے، والد صاحب کا ان سے بھی گہرا ربط و تعلق تھا، کم از کم ہفتہ میں ایک دن ملاقات ضرور ہوتی تھی، جب والد صاحب اور یہ حضرات جمعہ کی نماز پابندی سے جامع مسجد میں پڑھتے اور اس سے فراغت کے بعد امام صاحب کے کمرہ میں آدھ گھنٹہ بیٹھ کر لطف صحبت و ملاقات اٹھاتے۔

ان رشتہ داریوں کی وجہ سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا گاہے گاہے آگرہ آنا جانا رہتا اور مفتی صاحب بھی اُن کے ہمراہ ہوتے، حضرت مفتی صاحب جب کبھی آگرہ آتے ہمارے گھر بھی تشریف لاتے اور والد صاحب قبلہ آپ کی بڑی شاندار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دعوت کا اہتمام کرتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے ایک مرتبہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی بڑی بہن عطیہ بھی ہمارے گھر آئی تھیں اور میں اُن کے اور چند اور خواتین کے ساتھ تاج محل دیکھنے گیا تھا، ایک مرتبہ مفتی صاحب سے آگرہ کا ذکر آیا تو بولے: ابّا جی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کا کشف قبور کا علم بہت بڑھا ہوا تھا) قیام آگرہ کے دنوں میں ایک روز بادشاہ اکبر کے مقبرہ سکندرہ تشریف لے گئے تو قبر پر پہنچتے ہی آپ کی حالت متغیر ہوگئی اور طبیعت پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہوگئی اور فرمایا: جلد چلو، عذاب الٰہی نازل ہو رہا ہے، اس کے برعکس تاج محل میں شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبروں پر آئے تو وہاں اطمینان سے فاتحہ پڑھی۔

مفتی صاحب نے ایک مرتبہ یہ واقعہ بھی سنایا: ایک مرتبہ ابّا جی میرے ماموں حافظ عبدالحیٰ صاحب کے ساتھ مغرب کے بعد تشریف لے گئے، گھومتے پھرتے جمنا کی طرف جو فصیل ہے اس پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے، اس وقت فضا بڑی دلکش اور سہانی تھی۔ موسم نہ گرم نہ سرد بڑا خوشگوار تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی اور سبک و خنک ہوائیں موج زن ——— حافظ عبدالحیٰ صاحب دراز قامت، گورے چٹّے وجیہہ و مقبول صورت بزرگ تھے، سینہ چوڑا چکلا اور جسم ورزشی رکھتے تھے، عابد و زاہد اور نہایت متقی اور پرہیزگار اس درجہ تھے کہ کلکٹری میں سرشتہ دار کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ بھی رشوت کا گھر میں آسکے، حافظ قرآن اعلیٰ درجہ کے تھے، قرآن سے ان کو عشق تھا، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے تلاوت کرتے رہتے تھے، فن تجوید سے واقف تھے یا نہیں! اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ ان کی آواز میں اس درجہ درد اور لب و لہجہ میں اس غضب کا سوز و گداز تھا کہ سامعین پر ایک وجد اور سرشاری کا عالم طاری ہو جاتا تھا ——— مفتی صاحب کا بیان ہے: تاج محل کی اس ولولہ انگیز فضا میں بیٹھ کر ابا جی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے حافظ عبدالحیٰ صاحب سے قرآن مجید سنانے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمائش کی، وہاں تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا، باوضو تو وہ ہر وقت رہتے اور سبحہ گردانی کرتے ہی رہتے تھے، فوراً سورۂ واقعہ شروع کردی، سورت کے مضامین اور ان کا وہ اسلوب اور آہنگ اور پھر حافظ صاحب کا وہ لحن داؤدی! اک سماں بندھ گیا۔ اباجی پر استغراق کا عالم دیر تک طاری رہا۔

حضرت مفتی صاحب کے علمِ کشفِ قبور کا ذکر ابھی آیا ہے، اس سلسلہ کا ایک واقعہ اور سُن لیجیے، ایک دن مفتی صاحب نے ذکر کیا: ایک مرتبہ اباجی مجھے ساتھ لے کر مدراس تشریف لے گئے جہاں آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ تھا۔ اس سفر میں ہم سرنگا پٹم بھی گئے۔ یہاں اباجی جب سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر پہونچے تو آپ بیٹھ گئے اور دیر تک مراقب ہو کر ایصال ثواب کرتے رہے جب فارغ ہو کر اٹھے تو چہرہ پر بشاشت ونشاط کا عجیب عالم تھا اور فرمایا: اس مزار میں جو شخص دفن ہے، اللہ کے ہاں اسے شہادت کا بڑا اونچا مقام ملا ہے، رحمت باری کا نزول مسلسل ہو رہا ہے۔

بہرحال یہ تھی نوعیت ان تعلقات کی جو مفتی صاحب کے اور میرے خاندانوں میں میری پیدائش سے بھی پہلے سے تھے۔

اب میرے ابتدائی حالات سنیئے تاکہ مجھ کو اکابر مشائخ و علمائے دیوبند کے ساتھ اللہ کے فضل و کرم سے جو قرب و اختصاص رہا ہے اس کا پس منظر آپ کے سامنے آسکے۔

اگرچہ میرا ددھیال بچھراؤں ضلع مرادآباد اور ننھیال سیوہارہ ضلع بجنور ہے لیکن والد ماجد ڈاکٹر محمد ابرار حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بسلسلۂ ملازمت سرکاری پہلے اترپردیش کے مختلف شہروں میں ادھر ادھر رہے، پھر آخر میں آگرہ پہونچے تو یہاں ایسا جے کہ یہیں سے پنشن یاب ہوئے اور یہیں رہ پڑے، میری پیدائش آگرہ کی ہے اس لیے اکبرآبادی کہلاتا ہوں[1] والد صاحب آگرہ کے نامی گرامی ڈاکٹر تھے اس لیے سرکاری تنخواہ کے علاوہ

[1] میں پہلے نام کے ساتھ "اکبرآبادی" نہیں لکھتا تھا، یوں کبھی بھولے بسرے (باقی اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پرائیویٹ پریکٹس کی آمدنی بھی بہت معقول رکھتے اور بڑی فراخی اور کشادہ دستی سے گذر بسر کرتے تھے اور میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے رسم و رواج زمانہ کے مطابق انھیں چاہیے تھا کہ مجھ کو انگریزی تعلیم دلاتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کی وجہ سے دوستوں میں مطعون ہوئے اور سارے آگرہ میں نکّو بنے، مسٹر اختر عادل آگرہ کے مشہور ایڈوکیٹ تھے اور بعد میں پاکستان گورنمنٹ کے ایڈوکیٹ جنرل ہو گئے تھے۔ والد صاحب سے ایک مرتبہ انھوں نے خود میرے سامنے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ کو یہ کیا سوجھی کہ لڑکے کو مُلّا بنا رہے ہیں، آپ اس کو انگریزی پڑھاتے، ذہین بچہ ہے بڑا اچھا بیرسٹر ہوتا، ڈاکٹر تصدق حسین آگرہ کے بڑے نامور ڈاکٹر تھے، ایک روز انھوں نے ارشاد فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ سعید کو انگریزی پڑھوا کر میڈیکل ایجوکیشن میں بھیجتے بڑا

(پچھلے صفحے کا بقیہ) سے لکھدیا ہو اس کا اعتبار نہیں، چنانچہ میری تمام اسانیہ، ابتدائی تصنیفات اور خود برہان کے ٹائیٹل پیج پر صرف میرا نام درج ہے، لیکن ۱۹۴۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے گورنمنٹ مغربی بنگال کو میری کلکتہ مدرسہ کی پرنسپلی کے بارہ میں خط لکھا تو اس خط میں مولانا نے میرے نام کے ساتھ اکبرآبادی کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کی وجہ سے تمام سرکاری کاغذات میں اکبرآبادی میرے نام کا جزءِ لاینفک ہو گیا، اس سلسلہ میں یہ ایک واقعہ بھی لائق ذکر ہے کہ ۱۹۶۳ء میں جب میں کناڈا سے نیویارک (امریکہ) گیا اور وہاں سے ایک دن کے لیے پرنسٹن یونیورسٹی بھی آیا تو جب میں یونیورسٹی کی لائبریری میں گھوم پھر رہا تھا اچانک لائبریرین میرے پاس آئے اور میری کتاب "فہم قرآن" کا جو نسخہ ان کے ہاتھ میں تھا اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "جناب! کیا اس کتاب کے مصنف آپ ہی ہیں؟" جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے فوراً کتاب کی لوح پر میرے نام کے آگے اکبرآبادی کا لفظ بڑھا دیا تاکہ یہ Surname کی حیثیت سے مستعمل ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہونہار لڑکا ہے، بہت کامیاب ڈاکٹر ہوگا، عربی پڑھ کر اسے کیا ملے گا! سید نیاز احمد صاحب کوثر قوال شہر حضرت ریاض خیر آبادی کے برادر خورد اور خود بھی صاحب دیوان شاعر والد صاحب قبلہ کے جگری دوست تھے، ایک دن بولے: ابرار (والد صاحب کا نام) تمہارے پاس کمی کس چیز کی ہے، سعید کو انگریزی کی تعلیم دلا کر مقابلہ کے امتحان میں بٹھاتے، بڑا اچھا ڈپٹی کلکٹر یا مجسٹریٹ ہوتا، یہ عربی تعلیم کس کام آئے گی"۔ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں اور "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ایسے موقعوں پر والد صاحب کا عام جواب یہ ہوتا: اللہ کا حکم اور مشیت ہی یہ ہے۔ اس کی مشیت کے بغیر تو کوئی کام ہوتا نہیں ہے، لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ آخر والد صاحب نے ایسی تعلیم کا فیصلہ کیوں کیا جس کی اس زمانہ میں کوئی قدر و منزلت نہیں تھی اور جو مولانا شبلی کے لفظوں میں "آنچہ با ہیچ نیرزد بجہاں" کا مصداق تھی!

ایک روز احباب خاص کی مجلس میں والد صاحب قبلہ نے فرمایا:

"سعید میاں کی پیدائش سے پہلے میرے ایک لڑکی تھی، قمر النساء نام تھا۔ یہ بچی دس برس کی تھی کہ آگرہ میں طاعون پھیلا۔ خدا کی شان ہے اس مرض کے کتنے ہی بیمار میرے ہاتھوں اچھے ہو گئے تھے، لیکن خود میری اپنی بچی اس کا شکار ہو گئی، قمر کے بعد میرے ہاں کوئی اور بچہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے اب کیا توقع ہو سکتی تھی، میرا جی دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور میں نے ہجرت کا پکا ارادہ کر لیا، لیکن اجازت طلبی کے لیے جب میں نے اپنے پیر و مرشد حضرت قاضی عبدالغنی صاحب[1] منگلوری کو خط لکھا تو انھوں نے جواب میں ہجرت نہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی لکھا:

---

[1] بچپن میں متعدد بار خاکسار کو حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ حضرت مولانا محمد اسماعیل منگلوری جو مشہور عالم اور بزرگ تھے ان کے فرزند ارجمند تھے، شروع میں لاابالیانہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن (باقی اگلے صفحے پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تم گھبراؤ نہیں اور مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ تم کو "فرزند سعید" عطا فرمائے گا چنانچہ اس بشارت کے کئی برس بعد یہ بچہ پیدا ہوا، اس کے علاوہ ایک واقعہ یہ ہوا کہ اس بچہ کی ولادت سے دو تین گھنٹے پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی تشریف لائے ہیں، میں نے انھیں دیکھا تو سروقد کھڑا ہو گیا، علیک سلیک کے بعد عرض کیا: حضرت تشریف رکھیے، ادھر سے ارشاد ہوا: ڈاکٹر! فرزند سعید مبارک ہو، ہم بیٹھیں گے نہیں، اسی مبارکباد کی غرض سے آئے تھے۔" بس یہ فرمایا اور رخصت ہو گئے۔"

والد صاحب نے اس کے بعد فرمایا:

"پیر و مرشد کی بشارت اور پھر یہ خواب اور دونوں میں فرزند سعید کے الفاظ مشترک میں نے غور کیا تو میں سمجھا کہ یہ سب کچھ اشارہ غیبی ہے اس امر کی طرف کہ میں بچہ کا نام سعید رکھوں اور

(بقیہ صفحہ گذشتہ) پدر بزرگوار کی وفات کے بعد اچانک آپ میں انقلاب پیدا ہوا، ایک کوٹھری میں بند ہو کر چالیس دن کا چلّہ کھینچا جس میں جو کی دو ٹکیوں کے علاوہ کچھ اور نہ کھاتے تھے، مقررہ مدت کے بعد چلہ سے باہر آئے۔ تو اب عالم ہی دوسرا تھا، جذب اور استغراق کا عالم طاری رہتا تھا۔ نگاہوں میں عجب کشش تھی، ان کے کشف اور کرامتوں کا چرچا عام تھا۔ مریدوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اس میں سرکاری افسروں اور امراء و روساء کی کثرت تھی، حضرت اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی بھی آپ کے جاں نثار مرید تھے، زندگی شاہانہ تھی، سات مشکی گھوڑے میں نے خود ان کے اصطبل میں گنے ہیں، بدعات کے سخت دشمن تھے، اتباع سنت پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: تو میری دعاؤں سے پیدا ہوا ہے، اپنے باپ اور ماں کی طرح تو بھی میرا مرید ہو جا۔" میں بزرگوں کی مجلس میں گستاخ ہمیشہ کا ہوں، فوراً عرض کیا: حضرت مجھ پر تو ابھی نماز بھی فرض نہیں ہے۔ والد صاحب اس گستاخی پر مجھے سرزنش کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت قاضی صاحب نے روک دیا اور ہنس کر فرمایا: شاباش! ایسا ہی صاف گو ہونا چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیوبند میں اسے عربی اور دینی تعلیم دلاؤں۔

جب والد صاحب قبلہ نے میری تعلیم کے بارہ میں یہ قطعی فیصلہ کر لیا تو اب انہوں نے اس کا اہتمام بھی اس درجہ کیا کہ کوئی اولاد کی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا، میری بسم اللہ کے لیے حضرت قاضی صاحب کو منگلور لکھا تو آپ نے اسی مقصد کے لیے اپنے ایک عزیز میاں محمد افضل کو بھیج دیا۔ یہ اگرچہ عالم نہیں تھے، لیکن نیم مجذوب تھے اور مشہور تھا کہ مادرزاد ولی اور مستجاب الدعوات ہیں، اس کے بعد ایک حافظ اور ایک مولوی صاحب کا تقرر کر دیا گیا جن سے میں نے علی الترتیب قرآن مجید پڑھا اور اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

اب عربی کی تعلیم شروع کرنے کا وقت آیا تو والد صاحب نے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی کو دیوبند لکھا کہ مجھے اپنے بچہ کی عربی تعلیم کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت ہے، ازراہ کرم کسی اچھے عالم کا انتخاب کر کے بھیج دیجیے۔ تنخواہ معقول دوں گا، لیکن عالم کا متقی پرہیزگار ہونا ضروری ہے، کیونکہ بچہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی ان کے سپرد ہوگی۔ دیوبند کے شیوخ میں سے ایک صاحب مولوی خورشید علی نام کے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور آج کل دارالافتاء میں کام کر رہے تھے، عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوگی، گورے چٹے اور نورانی شکل وصورت کے انسان تھے، حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی کے خلیفہ مولانا عبدالکریم صاحب سے بیعت تھے اس لیے اوراد و وظائف کے بھی پابند تھے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے لیے ان کا انتخاب کیا اور انھیں آگرہ بھیج دیا۔[1]

---

[1] مولوی خورشید علی صاحب کے والد مولوی فرزند علی دیوبند کے وکیل یا مختار تھے، دارالعلوم دیوبند کا مکان جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رہتے تھے۔ (باقی اگلے صفحے پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولوی صاحب کی تنخواہ کیا تھی؟ اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ یہ معلوم ہے کہ موصوف ہمارے مکان (واقع لوہامنڈی) کے قریب ہی ایک مکان کرایہ پر لے کر مع متعلقین کے رہتے اور اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے، ان کے متعلقین میں ایک عمر سے ڈھلی ہوئی خوبصورت بیوی، دو جوان لڑکیاں، رضیہ اور فاطمہ اور ایک جوان لڑکا حسن۔ اس طرح لے دے کے کل پانچ آدمیوں کا یہ کنبہ تھا، ییں وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ۔ کا مصداق تھا، اس لیے پردہ و زدہ کسی سے نہیں تھا، بے تکلف گھر میں آنا جانا تھا۔

والد صاحب قبلہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ صرف فارسی اور عربی کی تعلیم کافی نہیں ہے، بلکہ بعض اور اہم مضامین کی تعلیم بھی ضروری ہے، چنانچہ انھوں نے میرے لیے ایک قابل ہندو گریجویٹ، مسٹر مکٹ بہاری لال ماسٹر کا بھی تقرر کیا اور اب پروگرام یہ ہو گیا کہ صبح چار گھنٹے مولوی خورشید علی صاحب مجھ کو عربی اور اس کے متعلقات کی تعلیم دیں گے اور شام کو دو گھنٹے ماسٹر صاحب انگریزی، حساب اور تاریخ و جغرافیہ پڑھائیں گے، مولوی صاحب کے سپرد یہ کام بھی تھا کہ وہ دونوں وقت کھانا میرے ساتھ کھائیں گے، مسجد میں اپنے ساتھ مجھ کو بھی لے جائیں گے اور صبح شام کی ہوا خوری میں بھی وہ میرے ساتھ ہوں گے۔

مولوی خورشید علی صاحب محبت اور توجہ سے پڑھاتے تو تھے ہی، بڑی بات یہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ان کو تصوف کا بڑا ذوق تھا، مثنوی مولانا روم کے عاشق تھے۔ اس لیے اکثر بزرگان اور اولیائے کرام کے قصے سناتے اور قرآن مجید

(بقیہ صفحہ گذشتہ) دراصل انھیں مولوی فرزند علی کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب مولوی خورشید علی اس کے مالک ہوئے تو باپ چونکہ قرض بہت کافی چھوڑ گئے تھے اس لیے مولوی خورشید علی صاحب نے یہ مکان دارالعلوم کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے احکام کی حکمتیں بیان کرتے رہتے تھے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دین کی عظمت اور بزرگانِ دین کی محبت بچپن میں ہی دل میں بیٹھ گئی اور اتالیق رکھنے سے دراصل والد صاحب کا مقصد بھی یہی تھا، میری عربی کی تعلیم کافیہ تک ہوئی تھی کہ مولوی خورشید علی صاحب چلے گئے اور ان کی جگہ دیوبند سے ہی مولوی غلام نور صاحب آئے جو سرحدی اور نہایت قابل آدمی تھے، وہ ہمارے ہاں نو دس ماہ رہے ہوں گے لیکن اس مدّت میں مشق و تمرین کے ذریعہ انھوں نے صرف و نحو کے قواعد دماغ میں کالنقش فی الحجر کرادیے جس کا اثر میں اب تک محسوس کرتا ہوں اور چونکہ مشق و تمرین کے لیے مولوی صاحب سب مثالیں قرآن مجید سے لیتے تھے اس لیے ابتدا میں ہی قرآن مجید سے مناسبت اور کچھ شد بد پیدا ہو گئی، علاوہ ازیں مجھ کو نحو ایسے خشک اور بے مزہ فن سے ایسی دلچسپی ہو گئی کہ بعد میں کتاب سیبویہ اور النحو الوافی کا مطالعہ میں نے خود اپنے شوق سے کیا۔

کم و بیش چار برس تعلیم کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ کافیہ، قدوری وغیرہ تک پڑھ چکا تھا اس کے بعد والد صاحب نے میری انگریزی تعلیم موقوف کردی کیوں کہ اب دونوں قسم کی تعلیم ساتھ نہیں چل سکتی تھی اور مقصد اصل عربی تعلیم کی تکمیل تھا۔ علاوہ ازیں اب والد صاحب نے مجھ کو مدرسہ میں داخل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا، چنانچہ مراد آباد کے مدرسہ امدادیہ میں داخل کر دیا گیا۔ مراد آباد میں میرے اعزا و اقربا کافی تعداد میں تھے، لیکن والد صاحب نے کسی کے مکان پر میرے تنہا رہنے کو پسند نہیں فرمایا، ایک مکان کرایہ پر لیا اور دو نوکروں کے ساتھ میری والدہ اور ہمشیرہ خورد کو بھی میری خاطر مراد آباد بھیج دیا، مدرسۂ امدادیہ مراد آباد کے صدر مدرس مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری تھے، اور مدرس مولوی محمد اسحاق صاحب کانپوری اور مولوی محمد حنیف صاحب امروہوی تھے میری کتابیں شرح جامی، شرح وقایہ وغیرہما ان تینوں حضرات کے پاس تھیں، تعلیمی سال کے ختم پر مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری امدادیہ مدرسہ چھوڑ دارالعلوم دیوبند آگئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو اب والد صاحب نے مجھ کو بھی دیوبند بھیجنے کا ارادہ فرما لیا، یہ غالباً ۱۹۲۱ء، یا ۱۹۲۲ء کی بات ہے۔

لیکن والد صاحب نے جو اہتمام مراد آباد میں کیا تھا وہی یہاں کیا، مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحیٔ صاحب مرحوم و مغفور آگرہ کی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر دیوبند میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، یہاں محلہ شاہ ابو المعالی میں ان کا ایک ذاتی مکان تھا اس میں رہتے تھے، اسی مکان کی بغل میں حافظ صاحب کا ایک اور مکان تھا والد صاحب نے یہ مکان جس کا اصل دروازہ بھی پہلے مکان کے اندر ہی تھا حافظ صاحب سے کرایہ پر لے لیا اور میرے ساتھ آگرہ کا پورا گھر بار مع دو نوکروں کے اس گھر میں منتقل کر دیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ چھ ماہ کی رخصت لے کر خود بھی دیوبند آ گئے، میں نے اگر شروع میں کہا ہے کہ والد صاحب قبلہ نے میری عربی تعلیم کا اہتمام اتنا کیا کہ کوئی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا۔ تو فرمائیے میں نے کیا غلط کہا۔ والد صاحب کی پریکٹس کی آمدنی کا اوسط اگر کم سے کم ایک ہزار روپیہ ماہوار بھی مان لیا جائے تو مہینے کی رخصت کے یہ معنی ہوئے کہ انھوں نے چھ ہزار کا نقصان کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند سے والد صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ لڑکے کو طالب علمی کرانے لائے ہیں یا نوابی کرنے، والد صاحب نے جواب دیا: حضرت! بچہ بہت لاڈ اور پیار کا پالا ہوا ہے، کبھی گھر سے باہر نکلا نہیں ہے اس لیے مہربانی فرما کر صرف ایک برس کی اجازت دے دیجیے، بات رفت گذشت ہوئی دارالعلوم میں میرا داخلہ ہو گیا، اور میں پورے گھر کے ساتھ محلہ شاہ ابو المعالی میں رہنے لگا۔

مفتی صاحب کے اور میرے تعلق کی داستان کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ اکثر و بیشتر عصر کی نماز کے بعد اپنے بہنوئی یعنی حافظ عبدالحی صاحب مرحوم کے گھر تشریف لاتے تھے اور مفتی صاحب،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کے فرزند اکبر آپ کے ہمراہ ہوتے، ہمارا مکان بغل میں تو تھا ہی، وہاں سے اٹھ کر حضرت مفتی صاحب ہمارے گھر آتے اور کچھ دیر والد صاحب کے پاس بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ والد صاحب سخت بیمار ہوگئے اور علالت کا سلسلہ طویل ہوگیا جس کے باعث ہم سب لوگ سخت پریشان تھے، اس زمانہ میں دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی پابندی سے ہمارے گھر آتے اور والد صاحب پر کچھ پڑھ پڑھ کے دم کرتے رہتے تھے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ خاص اور ان کی دعاؤں کا اثر تھا کہ جس روز والد صاحب کی رخصت ختم ہونے والی تھی اور ہم لوگ سخت پریشان اور فکر مند تھے کہ اگر رخصت کے ختم ہونے تک والد صاحب شفایاب نہ ہوئے تو ان کی سرکاری ملازمت کا کیا ہوگا۔ اس کے دو دن پہلے اچانک خود بخود ایسے صحت یاب ہوئے کہ گویا کبھی بیمار ہی نہ ہوئے تھے۔

مجھ میں اور مفتی صاحب میں فاصلہ بہت کافی تھا، کیونکہ وہ عمر میں مجھ سے سات برس بڑے، میں متوسطات کا طالب علم اور وہ معین المدرسین۔

اس قدرتی فاصلہ کے باعث شروع شروع میں میرے اور ان کے درمیان یک گونہ حجاب سا رہا لیکن مفتی صاحب کی روزانہ آمد و رفت اور غیر معمولی توجہ اور کرم نے مجھ کو جلد بے تکلف بنا دیا۔

وقت گذرنے کے ساتھ بے تکلفی بڑھتی رہی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہوگئے کہ میں مفتی صاحب کے خاندان کا ایک فرد ہوگیا اور مفتی صاحب میرے خاندان کے، چنانچہ ایک مرتبہ اماں جی (مفتی صاحب کی والدۂ محترمہ، جن کی وفات پر میں نے مہاجر میں ایک مضمون بھی لکھا تھا) مجھ سے فرمایا: میرے دو نہیں بلکہ تین بیٹے ہیں، عتیق، جلیل اور سعید۔ لیکن اس تمام بے تکلفی اور قربت کے باوجود مفتی صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور میرے درمیان سن و سال اور مرتبہ و مقام کا جو فاصلہ تھا اس کو میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ چنانچہ میں ان کو اپنا برادرِ بزرگ سمجھتا تھا اور وہ مجھ کو برادرِ خورد جانتے تھے، لیکن ایسا برادر جو دوست بھی ہو، کسی نے ایک عقلمند سے پوچھا: بھائی بہتر ہوتا ہے یا دوست ہ اس نے جواب دیا: وہ بھائی کس کام کا جو دوست نہ ہو، اور میں دوست بھی تھا اور بھائی بھی، اس لیے یہ رشتہ بہت قوی تھا اور مضبوط بھی۔

میں ایک برس والدہ صاحبہ وغیرہا کے ساتھ محلّہ ابو المعالی میں رہا، پھر سب لوگ آگرہ چلے گئے، تو میں بڑے بھائیوں کے محلہ میں ایک مکان میں رہنے لگا۔

اس کے بعد میں نے مدرسہ کے اندر رہنے کا ارادہ کیا تو مدرسہ کے صدر دروازے کے اوپر جو ایک کمرہ بنا ہوا ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی، جن کا شمار اکابر اساتذہ دارالعلوم میں ہوتا تھا رہتے تھے۔ اس کمرہ کی بغل میں ایک کمرہ ہے، والد صاحب قبلہ کی خواہش کے مطابق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے میرے لیے یہ کمرہ تجویز کیا کہ میں ایک طرف خود ان کی اور دوسری جانب مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کی براہ راست نگرانی میں رہوں، اس طرح بسلسلۂ طالب علمی میرے قیام دارالعلوم کے تین دور ہیں، دورِ اول میں میں گوشہ نشین رہا۔ گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر، بس یہ میری دنیا تھی، طلباء سے خلا ملا بالکل نہیں تھا، البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں مفتی صاحب سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی، دورِ ثانی میں تعلقات کا حلقہ وسیع ہوا۔ میں نے طلباء کی انجمنوں کے جلسوں میں شرکت اور ان میں تقریر کرنا شروع کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح کے ہاں ان کی بیٹھک میں روزانہ مغرب سے عشاء تک مجلس ہوتی تھی جس میں خالص علمی اور دینی گفتگو ہوتی تھی۔ وقتاً فوقتاً میں بھی اس مجلس میں شریک ہوتا تھا، ایک روز میں اور مفتی صاحب ہم دونوں اس مجلس میں حاضر ہوئے تو حضرت الاستاذ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میاں سعید! تم تقریر کی مشق بھی کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! جمعیت محمودیہ کا جلسہ ہر جمعرات کو عشاء کے بعد ہوتا ہے، میں اس میں شریک ہو کر تقریر کرتا ہوں، مفتی صاحب کو بھانجی مارنے میں مزہ آتا تھا، فوراً بول پڑے: یہ تقریر کیا کرتے ہیں، بس مولانا ابوالکلام آزاد کی کسی تقریر کے ایک جز کو رٹ لیتے ہیں اور جلسہ میں آکر اسے اُگل دیتے ہیں۔ حضرت الاستاذ نے یہ سنا تو بے ساختہ ہنس پڑے، پھر فرمایا: شروع شروع میں یہ عادت بُری نہیں، اچھی ہے، کیوں کہ اس طرح ایک نامور ادیب وخطیب کے خاص خاص جملے اور الفاظ زبان زد ہو جاتے ہیں اور مقرر اپنی تقریر میں انھیں الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے اور اس طرح ایک دن وہ خود صاحب طرز اچھا مقرر بن جاتا ہے، لیکن یہ عادت مستقل ہرگز نہ ہونی چاہیے یہ بات تو ختم ہوگئی، لیکن اس کے بعد حضرت الاستاذ نے جو حکیمانہ بات کہی وہ بھی سننے کے لائق ہے، ارشاد ہوا: ہاں میاں! تقریر کی مشق ضرور کیا کرو، یہ سمجھو کہ انسان کا سر ایک صندوق ہے اور زبان اس کی کنجی ہے، اب فرض کرو تمہارے پاس ایک صندوق ہے جو ہیرے جواہرات سے پُر ہے لیکن اگر صندوق کی کنجی تمہارے پاس نہیں ہے تو پھر صندوق کس کام کا؟ اس سے نہ خود تم فائدہ اٹھا سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا، ہاں اگر کنجی تمہارے قبضے میں ہے تو اب صندوق تمہارے لیے بھی کارآمد ہوگا اور دوسروں کے لیے بھی۔

اس زمانہ میں مفتی صاحب کے گھر آنا جانا بھی زیادہ ہوگیا تھا اور اس طرح مفتی صاحب کے ذاتی فضائل وکمالات اور خاص عادات واطوار، جن کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا، ان کے مشاہدہ ومعائنہ کا موقع تو ملا ہی تھا، بڑی بات یہ ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت سے مستفید ومستفیض ہونے اور آپ کی نہایت سادہ اور بے تکلف مگر انتہائی عارفانہ زندگی کے احوال وشئون کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

براہِ راست اور قریبی مطالعہ کی سعادت نصیب ہونے لگی، حضرت مفتی صاحب کا روحانی مرتبہ و مقام کیا تھا؟ اس کا اندازہ تو میرا ایسا عامی آدمی کیا کر سکتا ہے۔ البتہ جزبات میں اپنے علم و یقین کی روشنی میں جزم اور قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقر و درویشی جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے سرمایۂ فخر فرمایا ہے، اس کا جو عالم میں نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اقدس میں دیکھا ہے وہ عرب و عجم میں کہیں نظر نہیں آیا، وہ دارالعلوم دیوبند کے مفتیِ اعظم اور شیخِ کامل تھے، ان کے شاگردوں اور مریدوں اور معتقدوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، پھر مدرسہ میں چپراسی اور خدّام بھی کم نہیں تھے، لیکن بایں ہمہ صبح کے وقت مدرسہ جانے سے پہلے گھر کا سودا سلف لینے خود بازار جاتے تھے اور بازار جاتے وقت آس پاس کے گھروں کی عورتوں سے پوچھ لیتے تھے تاکہ انھیں کچھ منگانا ہو تو وہ بھی لیتے آئیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت و توجہات عالیہ سے میں نے کیا کچھ حاصل کیا ہے اس کا ذکر آئندہ جستہ جستہ آتا رہے گا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ سنیئے، ایک مرتبہ حضرت موصوف مفتی صاحب کو اور مجھے ساتھ لے کر ایک بیل گاڑی کے ذریعہ دیوبند سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں پہونچے اور اپنے ایک مرید یا معتقد کے گھر قیام فرمایا، یہ مغرب سے ذرا پہلے جھٹ پٹے کا وقت اور موسم سرما کے آغاز کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد کھانا آیا تو وہ باجرے کی روٹی اور چنے کے ساگ پر مشتمل تھا اور شاید کوئی چٹنی یا اچار بھی اس کے ساتھ تھا، یہ دیکھتے ہی مفتی صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گیا، ان میں ایک کمال یہ تھا کہ کیسا ہی کوئی مجمع ہو وہ کسی ناگوار سے ناگوار احساس کو ظاہر کیے بغیر نہ رہتے تھے مگر ذرا مسکراتے ہوئے، آنکھوں کی ایک خاص گردش اور معصومانہ لب و لہجہ کے ساتھ اس کا اظہار اس بلیغ انداز میں کرتے تھے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ ایک لطیف طنز ہوتا تھا اور سامعین برا ماننے کے بجائے اچانک ہنس پڑتے تھے، تو پھر بھلا اس موقع پر وہ چوکنے والے کہاں تھے، بولے: ابا جی! کیا تزکیۂ نفس کی ایک شرط باجرے کی روٹی اور چنے کا ساگ کھانا بھی ہے؟ حضرت مفتی صاحب کو ہنسی آ گئی اور نرم اور دھیمی آواز میں فرمایا: میاں عتیق! کھا کے تو دیکھو، کیا مزے کی چیز اور جاڑوں کا تحفہ ہے، پھر حضرت مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: تمہاری کیا رائے ہے! میں نے عرض کیا: حضرت! سبحان اللہ، یہ گرم گرم روٹی اور اس پر خالص گھی چپڑا ہوا اور یہ ساگ خالص گھی میں بگھرا ہوا۔ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، ہم شہر والوں کو یہ کہاں نصیب! حضرت مفتی صاحب یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا: اصل مقام شکر ایسی ہی چیزیں ہیں جن کو عرف عام میں ادنیٰ اور معمولی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان چیزوں پر شکر کرنے میں انسان کا اپنے متعلق اعتراف ہیچ میرزی پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے ایک ایسی بات کہی کہ اسے سن کر کم از کم مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے دل پر ایک نشتر سا لگ گیا، ارشاد ہوا: یوں تو میں امیروں اور دولتمندوں کے ہاں ان کے مکلف کھانے بھی کھاتا ہوں اور ان کو اللہ کی بڑی نعمت جان کر شکر ادا کرتا ہوں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ گھر کا سادہ کھانا کھانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کے احساس سے قلب میں انشراح اور طمانیت کی جو کیفیت میں محسوس کرتا ہوں وہ مکلف کھانوں میں محسوس نہیں ہوتی، مفتی صاحب پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا؟ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ میں نے یہ دیکھا کہ انھوں نے دیہاتوں میں جانا عموماً ترک کر دیا تھا اور اگر کبھی حضرت مفتی صاحب نے ساتھ چلنے کو کہا بھی تو انھوں نے کہہ دیا: جلیل (قاری جلیل الرحمٰن صاحب مفتی صاحب کے برادر خورد) کو ساتھ لے جائیے، مجھ سے مٹی کے ڈھوبروں میں نہیں کھایا جاتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاں تو ذکر میرے قیام دارالعلوم کے دورِ ثانی کا ہو رہا تھا جب کہ میں بڑے بھائیوں نامی محلہ کے ایک مکان میں رہتا تھا جسے مردانہ مکان ہونے کی وجہ سے بیٹھک کہتے تھے، اس بیٹھک میں میرے ساتھ مفتی صاحب کے پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق صاحب کے فرزند ارجمند مولوی محمد آفاق بھی رہتے تھے جو دارالعلوم میں پڑھتے تھے اور اسباق میں مجھ سے جونیر تھے، اس لیے کبھی کبھی یعنی ہفتہ میں تین چار دن مجلس ہمارے ہاں اس بیٹھک میں جمتی تھی جس میں چار پانچ احباب شریک ہوتے تھے اور یہ سب دارالعلوم کی مختلف جماعتوں میں پڑھتے تھے، مجھ سے تعلق کی وجہ سے مفتی صاحب بھی ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، ارکان مجلس سب ہی فارسی اور اُردو شعر و ادب کا پاکیزہ اور شگفتہ ذوق رکھتے تھے اور خاص طور پر مفتی صاحب کا ذوق تو بہت ہی رچا بسا تھا اور وہ اگرچہ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس کی وجہ ایک تو خاندانی خصوصیت تھی اور پھر اکابر دیوبند کی اولاد کی طرح مفتی صاحب نے دارالعلوم کے درجۂ فارسی کے پنج سالہ نصاب کی تکمیل کی تھی اور ان کے استاد مولانا محمد یٰسین صاحب تھے جو اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کی مہارت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اور ان کی تعلیم کا انداز ایسا تھا کہ طالب علم میں فارسی زبان و ادب کا پختہ ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ مفتی صاحب کے ایک چچازاد بھائی جو ان کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر ہونے کے رشتہ سے بہنوئی بھی ہوتے جمیل الرحمٰن تھے، یہ انگریزی میں بی اے تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، مگر تھے نہایت ذہین اور طباع، اُردو زبان کے بلند پایہ شاعر تھے، طبیعت میں غضب کی روانی تھی، نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت تھی، جمیل تخلص کرتے تھے اُردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، تپ دق میں بیمار ہو کر جوانی میں چل بسے تھے[۱] مفتی صاحب اور مرحوم میں (حاشیہ اگلے صفحے پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رشتہ داری کے علاوہ ہم مذاقی کے باعث بہت گہرا ربط و تعلق تھا، اور اوّل درجہ کے سخن سنج و سخن گو اور یہ اعلیٰ قسم کے سخن فہم و سخن شناس، کوئی نئی غزل یا نظم جب تک مفتی صاحب کو سنا کر اس کی داد نہ لے لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ پھر پڑھتے بھی بہت خوب تھے۔ مفتی صاحب کا بیان ہے جب وہ مترنم ہوتے تھے ایک سماں بندھ جاتا تھا، مفتی صاحب کو ان کی غزلیں یاد تھیں۔

اب مفتی صاحب کے ذوقِ شعر و ادب کا یہ پس منظر ذہن نشین کر کے سنیئے ہماری اس مجلس میں گفتگو کا موضوع عموماً شعر و ادب ہوتا تھا، فارسی اور اردو دونوں کا کبھی عرفی اور نظیری پر تنقید ہو رہی ہے اور کبھی غالب کے مشکل اشعار مثلاً:

"ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق"

یا

"مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کوئی شعر لے لیا اور اس پر بحث شروع کر دی، مفتی صاحب ان گفتگوؤں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے اور بڑی جچی تلی بات کہتے تھے جس سے ان کے مخصوص ادبی افکار و نظریات کا علم ہوتا تھا۔ مثلاً فارسی شاعری میں تغزل کے اعتبار سے عرفی اور نظیری کو امیر خسرو سے بڑا شاعر مانتے تھے، کہتے تھے، خسرو میں قدرت کلام اور جرأت فکر بے پناہ ہے، لیکن سوز و گداز اور احساسِ درد و غم جو تغزل کی جان ہے عرفی اور نظیری کے کلام میں خسرو سے زیادہ ہے، اسی طرح مفتی صاحب اُردو شعراء میں غالب کی عظمت و فکر و خیال اور اس کے تیکھے اندازِ بیان کے معترف تھے لیکن اس کے

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) عرصہ دراز ہوا ماہنامہ جامعہ نئی دہلی میں، جبکہ اس کے ایڈیٹر مولانا اسلم جیراجپوری تھے، میں نے مرحوم پر ایک مضمون "اُردو کا ایک جوان مرگ شاعر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے مرحوم کو نہیں دیکھا تھا، مفتی صاحب سے جو کچھ سنا تھا مقالہ کی بنیاد وہی تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاں تو ذکر میرے قیام دارالعلوم کے دورِ ثانی کا ہو رہا تھا جب کہ میں بڑے بھائیوں نامی محلہ کے ایک مکان میں رہتا تھا جسے مردانہ مکان ہونے کی وجہ سے بیٹھک کہتے تھے، اس بیٹھک میں میرے ساتھ مفتی صاحب کے پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق صاحب کے فرزندارجمند مولوی محمد آفاق بھی رہتے تھے جو دارالعلوم میں پڑھتے تھے اور اسباق میں مجھ سے جونیر تھے، اس لیے کبھی کبھی یعنی ہفتہ میں تین چار دن مجلس ہمارے ہاں اس بیٹھک میں جمتی تھی جس میں چار یا پانچ احباب شریک ہوتے تھے اور یہ سب دارالعلوم کی مختلف جماعتوں میں پڑھتے تھے، مجھ سے تعلق کی وجہ سے مفتی صاحب بھی ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، ارکان مجلس سب ہی فارسی اور اردو شعر و ادب کا پاکیزہ اور شگفتہ ذوق رکھتے تھے اور خاص طور پر مفتی صاحب کا ذوق تو بہت ہی رچا بسا تھا اور وہ اگرچہ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس کی وجہ ایک تو خاندانی خصوصیت تھی اور پھر اکابر دیوبند کی اولاد کی طرح مفتی صاحب نے دارالعلوم کے درجۂ فارسی کے پنج سالہ نصاب کی تکمیل کی تھی اور ان کے استاد مولانا محمد یٰسین صاحب تھے جو اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کی مہارت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اور ان کی تعلیم کا انداز ایسا تھا کہ طالب علم میں فارسی زبان و ادب کا پختہ ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ مفتی صاحب کے ایک چچازاد بھائی جو ان کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر ہونے کے رشتہ سے بہنوئی بھی ہوتے جمیل الرحمٰن تھے، یہ انگریزی میں بی اے تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، مگر تھے نہایت ذہین اور طباع، اردو زبان کے بلند پایہ شاعر تھے، طبیعت میں غضب کی روانی تھی، نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت تھی، جمیل تخلص کرتے تھے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، تپ دق میں بیمار ہو کر جوانی میں چل بسے تھے۔ مفتی صاحب اور مرحوم میں (حاشیہ اگلے صفحے پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رشتہ داری کے علاوہ ہم مذاقی کے باعث بہت گہرا ربط و تعلق تھا، اور اول درجہ کے سخن سنج و سخن گو اور یہ اعلیٰ قسم کے سخن فہم و سخن شناس، کوئی نئی غزل یا نظم جب تک مفتی صاحب کو سنا کر اس کی داد نہ لے لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ پھر پڑھتے بھی بہت خوب تھے۔ مفتی صاحب کا بیان ہے جب وہ مترنم ہوتے تھے ایک سماں بندھ جاتا تھا، مفتی صاحب کو ان کی غزلوں کی غزلیں یاد تھیں۔

اب مفتی صاحب کے ذوقِ شعر و ادب کا یہ پس منظر ذہن نشین کر کے سنیئے ہماری اس مجلس میں گفتگو کا موضوع عموماً شعر و ادب ہوتا تھا، فارسی اور اردو دونوں کا کبھی عرفی اور نظیری پر تنقید ہو رہی ہے اور کبھی غالب کے مشکل اشعار مثلاً:

"ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق"

یا

"مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"

وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کوئی شعر لے لیا اور اس پر بحث شروع کر دی، مفتی صاحب ان گفتگوؤں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے اور بڑی جچی تلی بات کہتے تھے جس سے ان کے مخصوص ادبی افکار و نظریات کا علم ہوتا تھا۔ مثلاً فارسی شاعری میں تغزل کے اعتبار سے عرفی اور نظیری کو امیر خسرو سے بڑا شاعر مانتے تھے، کہتے تھے، خسرو میں قدرت کلام اور جرأت فکر بے پناہ ہے، لیکن سوز و گداز اور احساسِ درد و غم جو تغزل کی جان ہے عرفی اور نظیری کے کلام میں خسرو سے زیادہ ہے، اسی طرح مفتی صاحب اُردو شعرا میں غالب کی عظمت و فکر و خیال اور اس کے تیکھے انداز بیان کے معترف تھے لیکن اس کے

(پچھلے صفحے کا حاشیہ) عرصہ دراز ہوا ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی میں، جبکہ اس کے ایڈیٹر مولانا اسلم جیراجپوری تھے، میں نے مرحوم پر ایک مضمون "اُردو کا ایک جواں مرگ شاعر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے مرحوم کو نہیں دیکھا تھا، مفتی صاحب سے جو کچھ سنا تھا مقالہ کی بنیاد وہی تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باوجود ان کے نزدیک تغزل میں مومن کا مرتبہ غالب سے اونچا تھا اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ مومن میں جو سوز و گداز اور خود سپردگی ہے وہ غالب کے یہاں اس کی انانیت اور خود پرستی کی وجہ سے مفقود ہے اس سلسلے میں ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ دیکھیے غالب کا ایک شعر ہے:

جاتا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

اس شعر میں کس درجہ انانیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے خود کہا ہے:

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری

اس کے بالمقابل اب مومن کا شعر دیکھیے۔ کہتے ہیں:

اس نقشِ پا کے سجدے نے کتنا کیا ذلیل
میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ان دونوں شعروں میں کتنا بڑا فرق ہے ارباب ذوق اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ مفتی صاحب نے اپنے خاص درد بھرے لہجے میں مومن کی یہ غزل سنائی جس کے تین شعر مجھے اب تک یاد ہیں:

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
بے نالہ منہ سے گرتے ہیں بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا نہ حال پوچھ اضطراب میں

ان شعروں کو سنانے کے بعد مفتی صاحب نے بڑی قوت سے کہا کہ غالب کے پورے دیوان میں اس غزل کا کوئی جواب نہیں ہے۔ پھر ایک مرتبہ کہا کہ میں ہی نہیں خود غالب بھی مومن کے قائل تھے اسی وجہ سے تو جب انھوں نے مومن کا یہ شعر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سنا تو غالب پھڑک اٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کے لیے تیار ہوں غرض کہ ہماری اس مجلس میں اسی قسم کے ادبی مذاکرے ہوتے تھے اور مفتی صاحب اپنے بلند ذوقِ شعر و ادب کے جوہر دکھاتے رہتے تھے جس سے ہم لوگوں کو بہت فائدہ ہوا۔

دورِ جدید کے اُردو شعراء میں حسرت موہانی، مفتی صاحب کو سب سے زیادہ پسند تھے، وہ ان کے بڑے مدّاح اور معترف تھے، ان کی غزلوں کی غزلیں مفتی صاحب کو یاد تھیں، حسرت کی ایک غزل جس کے دو شعر یہ ہیں:

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں!

ایک اور غزل ہے جس کے یہ دو شعر اب تک مجھے یاد ہیں:

دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
قابلِ دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی

اے جفاکار ترے عہد سے پہلے تو نہ تھی
کثرت اس درجہ محبت کے پشیمانوں کی

مفتی صاحب کو حسرت کی یہ دو غزلیں بہت پسند تھیں، بہانہ بہانہ سے انھوں نے ان کو اتنی بار پڑھا کہ سنتے سنتے مجھے بھی یاد ہو گئی تھیں، ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا: تمہیں حسرت کا کون سا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟ میں نے کہا یہ شعر:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

بولے: اوہو! کیا غضب کی داخلیت ہے۔

حسرت سے مفتی صاحب کی ملاقات بھی عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی، ایک مرتبہ مفتی صاحب نے بیان کیا: تحریکِ خلافت شباب پر تھی، اس کی ایک کانفرنس کراچی میں تھی، اس میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند سے میں اور چند ساتھی کراچی کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں صبح کے وقت ہم بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ہمارے سروں پر اوپر کی برتھ پر ایک صاحب تشریف فرما ہیں جو فربہ اندام اور پست قامت ہیں، رنگ سانولا۔ چہرہ پر چیچک کے نشان، داڑھی گنجان، آنکھیں درخشاں اور بڑی، پیشانی فراخ اور کشادہ، نہایت موٹے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ، سر پر میلی کچیلی ترکی ٹوپی، عمر چالیس پچاس کے درمیان، اب ہم لوگوں کی ان بزرگوار پر اچانک نظر پڑی تو ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی، سوال یہ تھا کہ یہ ہیں کون بزرگوار؟ جتنے منہ اتنی باتیں، کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، میں نے کہا: یہ بزرگوار کوئی بھی ہوں مگر ہیں کوئی بڑے آدمی ضرور! اتنے میں ایک بڑا اسٹیشن آ گیا اور ہم نے ایک مکلّف ناشتہ کا آرڈر دیا، ناشتہ آ گیا تو ہم نے ان صاحب سے کہا: آئیے جناب ناشتہ کر لیجیے، وہ فوراً پھدک کر نیچے تشریف لے آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ اور گفتگو شروع ہوئی۔

ہم: جناب کہاں جا رہے ہیں؟

وہ: (منحناتی آواز میں) جی! میں کراچی جا رہا ہوں۔

اب ہمارے کان کھڑے ہوئے اور ہم نے پوچھا: کیا آپ بتا سکتے ہیں "کیوں"

وہ: وہاں خلافت کانفرنس میں شریک ہونا ہے۔

ہم: جناب کا اسمِ گرامی!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ : فضل الحسن میرا نام ہے۔

میں: (اشتیاقِ دید کی اضطرابی کیفیت کے ساتھ) ارے تو آپ مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں!

وہ : اب آپ نے پہچان ہی لیا تو میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔

یہ سن کر ہم سب کو بڑی خوشی ہوئی اور ہم میں سے ہر ایک نے بڑی عقیدت کے ساتھ مولانا سے مصافحہ کیا، اب مولانا نے کہا: آپ بھی تو اپنا تعارف کرائیں، جب مولانا کو علم ہوا کہ ہم سب دارالعلوم دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں اور مدرسہ کی جمعیت الطلبا کے عہدہ دار ہیں تو مولانا بڑے مسرور ہوئے اور ہم سے فرداً فرداً دوبارہ مصافحہ کیا، اب ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے تو میں نے مولانا سے عرض کیا: حضرت! ہم سب آپ کے کلام کے عاشق ہیں، کچھ عطا فرمائیے، مولانا نے فوراً سنانا شروع کر دیا۔ پہلے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے:

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی، مرے دل میں یا ذہن میں رہے

اس کے بعد دو تین غزلیں اور سنائیں، مفتی صاحب کہتے تھے: علاوہ شعر و شاعری کے مولانا کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پُر لطف ہوتی تھی۔

مجھے "بڑے بھائیوں" کے محلہ میں رہتے ہوئے دو برس ہی ہوئے تھے کہ رمضان کی تعطیل میں آگرہ آیا تو یہاں حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم دارالعلوم جن کی مشفقانہ توجہ اب میری طرف زیادہ ہوگئی تھی ان کا ایک والانامہ والد صاحب قبلہ کے نام موصول ہوا۔ جس میں تحریر تھا: "سعید دیوبند کے محلہ 'بڑے بھائیوں' میں رہتا ہے، وہاں اس کی صحبت قصبہ کے لڑکوں کے ساتھ رہتی ہے، میں اس کو پسند نہیں کرتا اس لیے اب آپ سعید کو مدرسہ کے احاطہ میں رکھیں۔" والد صاحب نے جواب دیا: "آپ نے بجا فرمایا میں تعمیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارشاد کروں گا، مگر درخواست یہ ہے کہ آپ سعید کو ایک کمرہ بلاشرکتِ غیرے دے دیں اور نیز آپ اس کو براہ راست اپنی یا کسی بڑے استاد کی نگرانی میں رکھ دیں۔" مہتمم صاحب نے دونوں باتیں مان لیں، چنانچہ مدرسہ یا مسجد کی طرف سے دارالاہتمام میں جانے کے لیے جو زینہ اوپر جا رہا ہے اس کے وسط میں بائیں جانب اس زمانہ میں صرف دو کمرے تھے (اب تیسرا بھی بن گیا ہے) ان میں سے ایک کمرہ جو دروازہ کے سیدھ میں ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد رشیدی رہتے تھے اور دوسرا کمرہ جو اس کی بغل میں ہے اس کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے میرے لیے تجویز فرمایا۔ اس بنا پر رمضان کی تعطیل کے ختم پر میں مدرسہ آیا تو اسی کمرہ میں فروکش ہوا اور رہنے لگا۔

اب میرے قیام دارالعلوم کا تیسرا دور شروع ہوا جو آخری بھی ہے، یہ دور جو تین برس کی مدت پر ممتد ہے، میری تعلیمی زندگی کا نہایت اہم دور ہے، کیونکہ میری تعمیر و تشکیل جو کچھ ہوئی ہے اسی دور میں ہوئی ہے، پہلے میرا ماحول شعری و ادبی تھا، لیکن اب میرا ماحول علمی اور دینی تھا، پہلے میری صحبت چند شہری طلبہ کے ساتھ تھی، اب میں ہر وقت اساتذۂ کرام اور چند نہایت ہونہار اور ذہین و مستعد مختلف صوبوں کے طلبہ کی معیت میں تھا۔ میرا کھانا پینا اور ناشتہ وغیرہ حضرت الاستاذ مولانا سراج احمد رشیدی کے ساتھ تھا، مولانا جو حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت بھی تھے، دارالعلوم کے اکابر اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اردو اور فارسی کے پختہ کلام شاعر بھی تھے، طبعاً نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور مجلسی بزرگ تھے، ہر جمعرات کو ان کے ہاں مغرب کے بعد احباب کی مجلس جمتی تھی جو اپنے گھر سے کھانا لاکر ایک ساتھ ہم طعامی کرتے تھے اور کھانے کے بعد سبز چائے کا دور چلتا تھا جس کا اہتمام مولانا بہت زیادہ کرتے تھے، اس مجلس کے ارکان خاص علامہ محمد ابراہیم بلیاوی،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی اور مولانا محمد بدر عالم صاحب میرٹھی۔ مفتی صاحب "طباخ" بھی بہت اچھے تھے اور خصوصاً مُرغ کا اسٹو پکانے میں تو ان کو بڑا کمال تھا۔ اسی لیے اس مجلس میں کبھی کبھی اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز بھی لے کر آتے، اسی طرح مولانا محمد بدر عالم صاحب بڑے اچھے شکاری تھے، اس لیے وہ کبھی مرغابی یا تیتر سے اس مجلس کی تواضع کرتے۔

مفتی صاحب اس زمانے میں مدرس تھے اور دارالافتاء میں فتویٰ نویسی بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں کرتے تھے، مفتی صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا بڑے شوق، دل کی لگن اور محنت سے پڑھا تھا، پھر ذکاوت و فطانت خداداد اور فطری اور اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار، اس بنا پر ہر علم وفن کی استعداد مفتی صاحب کی پختہ اور اعلیٰ تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ان میں ملکۂ تقریر و خطابت اعلیٰ قسم کا تھا، افہام و تفہیم کی صلاحیت قدرتی تھی، اپنے مافی الضمیر کا اظہار بڑی وضاحت اور صفائی سے کرتے جس میں گنجلک یا الجھن نام کو بھی نہ ہوتی تھی، اس بنا پر ان کا درس مقبول تھا، البتہ آواز ان کی بلند تھی اور درس بھی وہ اس بلند آواز سے دیتے تھے کہ ان کی آواز درس گاہ سے باہر دور تک جاتی تھی، مفتی صاحب کو خود بھی اپنی بلند آوازی پر ہنسی آتی تھی، ایک دن ہنستے ہنستے سنانے لگے: ایک مرتبہ جامعہ ازہر، مصر کے ایک استاد یہاں آئے ہوئے اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، ایک روز وہ درس گاہوں میں گھومتے پھرتے میری درسگاہ میں بھی آ گئے، میں اس وقت سلم العلوم (منطق) کا درس دے رہا تھا، میں نے مصری عالم کو خوش آمدید کہہ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور درس شروع کر دیا اور جب گھنٹہ بجا اور درس ختم ہو گیا تو موصوف مجھ سے مخاطب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئے اور بولے: "یا استاذ واللہ انک لرجلٌ فاضل، ولکنک تجھر جھیر البرق اخاف انک ستکون حمارًا" مفتی صاحب یہ واقعہ سنا کر خود بھی ہنس پڑے اور ہم سب کو بھی ہنسی آگئی۔

جہاں تک مفتی صاحب کی فتویٰ نویسی کا تعلق ہے اس کے متعلق وہ خود بیان کرتے تھے کہ شروع شروع میں وہ استفتا کا جواب بہت طویل لکھتے تھے جس میں موافق اور مخالف دلائل اور اخیر میں قول راجح کے دلائل اور ان کی عبارتوں کی بھرمار ہوتی تھی، لیکن حضرت مفتی صاحب ایسے تمام جوابات قلم زد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمہارا جواب ماقل ودل ہونا چاہیے، ہر عبارت نقل کے لائق نہیں ہوتی، پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مستفتی تم سے بحث نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک مسئلہ کے بارے میں صرف ایک حکم شرعی دریافت کر رہا ہے اس لیے تمہارا مطالعہ تو وسیع اور عمیق ہونا ضروری ہے لیکن جواب مختصر ہونا چاہیے جس میں صرف چھنی چھنائی بات کا ذکر ہو۔ مفتی صاحب کہتے تھے: بڑی مشق اور تمرین کے بعد جب مجھ میں یہ صلاحیت اور استعداد پیدا ہوگئی تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: "ہاں اب تم کو فتویٰ لکھنا آگیا"۔

نیشنلزم یعنی قوم پروری اور استخلاص وطن کی تڑپ جیسے مفتی صاحب کی گھٹی میں پڑی تھی، اس معاملہ میں جتنا سنجیدہ فکر اور پختہ خیال میں نے مفتی صاحب کو پایا ان کے معاصرین میں کسی کو نہیں پایا، ان کی طالب علمی کے زمانہ میں طلبا کا ایک قلمی اخبار نکلتا تھا جس کا نام یاد نہیں رہا، اس اخبار کی ایک اشاعت میں مفتی صاحب کا ایک طویل مضمون "سودیشی کی ضرورت" شائع ہوا تھا، میں نے یہ مضمون از اول تا آخر پڑھا مضمون نہایت مدلل اور بصیرت افروز، پر زور اور شگفتہ و دلکش زبان میں تھا، میرے دماغ پر مفتی صاحب کے حسن تحریر کا پہلا نقش ان کے اسی مضمون کے مطالعہ سے قائم ہوا تھا، انھوں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا تھا اس کے عملی پیکر وہ خود تھے، چنانچہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمانہ میں بھی جبکہ دارالعلوم کے "شہزادے" یعنی اکابر دیوبند کی اولاد، نہایت عمدہ ململ، چکن کے کرتوں اور چالیس ہزارہ کے لٹھے کے پاجاموں میں ملبوس نظر آتے تھے ــــ مفتی صاحب اس زمانے میں بھی کھدر پہنتے تھے، وضع کے اتنے پابند تھے کہ ایک کرتہ جو زیادہ لانبا نہیں ہوتا تھا بغیر کالر کے ہوتا اور پاجامہ چوڑے پائینچوں کا اور سیدھی کاٹ کا اور دونوں کھدر کے اور کرتہ کے نیچے بنیان وہ بھی کھدر کی، عمر بھر ان کا لباس یہی رہا، شیروانی پہنتے تھے مگر وہ بھی دیسی کپڑے کی، اس قسم کے وضع دار خال خال ہی ملیں گے۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی میرے ماموں زاد بھائی تھے اور مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، سیوہارہ کے مدرسہ میں تکمیل تعلیم کے بعد دورۂ حدیث کے لیے دیوبند آئے تھے اور جس سال (۲۵ء) میں خود دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اس سال یہ صحیح بخاری کا سماع کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا: تم ہمہ تن متوجہ ہو کر حضرت شاہ صاحب (علامہ محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کی تقریر سنو اور میں تمہارے لیے وہ تقریر لکھتا رہوں گا، چنانچہ انھوں نے دو موٹی موٹی کاپیاں لکھی تھیں، جنھیں میں حرز جاں بنائے رکھتا تھا، لیکن جب ۴۷ء میں میرا گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی گئیں:

کر دیا سفاک نے میدان صاف

مفتی صاحب کی طرح مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی شروع سے ہی جذبۂ استخلاص وطن و قوم پروری سے سرشار تھے اور ملکی و قومی مسائل و معاملات میں دونوں کے افکار و نظریات میں بڑی ہم آہنگی و یک جہتی تھی، اس پر مستزاد یہ کہ مولانا بڑے فعال و متحرک تھے، ان میں لیڈر بننے کے صفات بدرجہ اتم موجود تھے، ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے، اس وجہ سے اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صاحب اور مولانا میں دانت کاٹے کی دوستی تھی، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی (ثم مہاجر مدنی) کو ملکی سیاست اور قومی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اس لیے مفتی صاحب سے خاص تعلق اور ربط رکھتے تھے، اس طرح ہم چار آدمیوں (مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، مولانا بدر عالم اور راقم الحروف) کا ایک گروپ بن گیا تھا جو اوقات مدرسہ کے بعد عموماً ایک ساتھ رہتا تھا۔

ہم چاروں عصر کی نماز اکثر حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ان کی مسجد میں ادا کرتے تھے، اس مسجد میں دو کمرے تھے، ایک اندرون مسجد اور دوسرا بیرون مسجد، پہلا کمرہ حضرت مفتی صاحب کے لیے مخصوص تھا اور دوسرا مفتی صاحب کی نشست گاہ تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد اگر ٹہلنے یا کہیں جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو مغرب تک اسی کمرہ میں نشست رہتی، مسجد میں امامت عموماً تو حضرت مفتی صاحب ہی کرتے تھے۔ لیکن جہری نمازیں کبھی کبھی وہ مفتی صاحب کو آگے بڑھا دیتے تھے، مفتی صاحب حافظ اور ساتھ ہی قاری تو اول درجہ کے تھے ہی ان کی آواز میں لوچ اور ہلکا ہلکا سا درد بھی غضب کا تھا اس لیے نماز میں بڑا لطف آتا تھا، ایک واقعہ سنیئے:

سنہ ۳۶ء میں ایم اے کا امتحان دلی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد مفتی صاحب کی دعوت پر جب میں پہلی بار کلکتہ گیا تو ایک روز مفتی صاحب مولانا محمد حفظ الرحمٰن اور میں، ہم تینوں عصر کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لیے بالی گنج میں ان کی کوٹھی پر گئے۔ مولانا حسب معمول بڑے تپاک اور بے تکلفی سے ملے، باتیں کرتے کرتے مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تو مولانا کے ملازم "احمد" نے وہیں ڈرائنگ روم میں جانمازیں بچھا دیں، مولانا اور ہم باوضو تھے ہی، سیدھے مصلے پر جا کھڑے ہوئے، اب ہم نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، لیکن مولانا نہ مانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مفتی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔ مفتی صاحب نے سورۃ القارعہ اور سورۃ الھٰکم التکاثر اپنے لحن داؤدی میں تلاوت کیں، سلام پھیرنے کے بعد مولانا آزاد نے دو رکعتیں سنت کی ادا کیں مگر کمال خشوع وخضوع سے، اس کے بعد صوفہ پر بیٹھ گئے آنکھیں بند کرلیں، ایک اونی چادر جو اوڑھے تھے اس سے اپنے تمام جسم اور آنکھوں کو مستغنی کر کے تمام سر اور چہرہ چھپالیا۔ دس منٹ کے بعد جب آنکھیں کھولیں تو مفتی صاحب کو خطاب کر کے فرمایا: "مولوی صاحب! اگر اصول تجوید کی رعایت کے ساتھ حسن صوت نہ ہو تو مخارج صحیح ادا ہوں گے مگر دل پر اثر نہ ہوگا، اللہ جل شانہ کا آپ پر بڑا فضل وکرم ہے کہ تجوید کے ساتھ خوش آوازی کی نعمت سے بھی آپ بہرہ ور ہیں۔ اس لیے آپ کی قرارت دل کے دروازہ پر دستک دیتی ہے۔"

ایک مرتبہ اس مسجد میں بڑا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ ہم چاروں نے حسب معمول عصر کی نماز مسجد میں حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ادا کی، ایک بنگالی طالب علم تھا وہ بھی کم از کم عصر کی نماز تو اسی مسجد میں پڑھتا تھا، آج اس نے یہ کیا کہ نماز کا سلام پھیرتے ہی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: "حضرات! اب میں دیوبند سے جا رہا ہوں، آپ میرے لیے دعا کریں کہ میرا خاتمہ بخیر اور اسلام پر ہو۔" جب دعا ختم ہوگئی تو حضرت مفتی صاحب اس طالب کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: "تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے کہا: "تھانہ بھون" "کیوں؟" حضرت مفتی صاحب نے دریافت فرمایا "حضرت تھانوی مدظلہ العالی سے تصوف کی تعلیم وتربیت حاصل کرنے کے لیے" طالب علم نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت مفتی صاحب کو غصہ آگیا اور سخت لہجہ میں فرمایا: مولانا اشرف علی کو صوفی کون کہتا ہے، انھیں تصوف سے کیا واسطہ! حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ بہ ظاہر بہت سخت اور حیرت انگیز ہیں، لیکن ان کی وضاحت واقعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذیل سے ہو گی:

اس واقعہ کے چھ سات برس کے بعد جب میں مدرسۂ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی میں تھا، ایک روز میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ باتوں باتوں میں حضرت تھانوی کا ذکر نکل آیا تو میں نے یہ واقعہ سنایا، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اسے سنتے ہی ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے اور گردن جھکالی، تھوڑی دیر کے بعد گردن اٹھائی، .... اور تاثراتی لہجہ میں فرمایا:

"میاں سعید! کیا یہ واقعہ سچّا اور تمھارا عینی مشاہدہ ہے؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں! اس وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی موجود تھے، یہ دونوں حضرات تو یہیں دلّی میں موجود ہیں، آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں" یہ سن کر فرمایا: اگر یہ واقعہ صحیح ہے —— اور جب تم کہہ رہے ہو تو یقیناً صحیح ہی ہے —— تو آج میرے دل کی پُرانی گرہ کھل گئی اور اس کی تفصیل یہ ہے: تحریک خلافت اور اس کے ضمن میں تحریک ترک موالات بڑے زوروں پر تھی اور جمعیت علمائے ہند کے زیر قیادت بڑی کامیابی سے چل رہی تھی، لیکن مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اس تحریک میں نہ صرف یہ کہ شریک نہیں ہوئے، بلکہ اس کی مخالفت میں فتویٰ دیا۔ جمعیت علمائے ہند نے اس کا سخت نوٹس لیا اور طے کیا کہ جمعیت کا ایک سہ نفری وفد تھانہ بھون پہنچ کر براہ راست مولانا سے گفتگو کرے، اس وفد کے لیے تین نام منظور ہوئے: (۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی۔ (۲) مولانا احمد سعید دہلوی اور (۳) میں (حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ) ہم تینوں تھانہ بھون پہونچے اور تین روز مقیم رہے، مولانا سے ہم لوگوں کی گفتگوؤں کا جو حشر ہوا وہ تو سب کو معلوم ہے، دراصل سنانا یہ ہے کہ ایک دن ہم مولانا کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور سلام کرکے بیٹھ گیا، مولانا تھانوی اس کی طرف متوجّہ ہوئے اور پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت! میں مظاہر العلوم کا ایک طالب علم ہوں، حضرت سے استفادۂ باطنی کی غرض سے حاضر ہوا ہوں، مولانا نے پوچھا کیا تم نے پہلے سے خط کے ذریعہ اس کی اجازت لی ہے، یہ شخص بولا: جی نہیں، اس پر مولانا نے برہم ہو کر کہا کہ تم اٹھ جاؤ، مگر وہ نہیں اٹھا، مولانا نے پھر کہا جاؤ مگر وہ پھر بھی بیٹھا رہا، اس پر مولانا کے پاس ایک رسّی کا بنا ہوا سونٹا رکھا رہتا تھا اس سے مولانا نے اس کو مارنا شروع کیا مگر یہ شخص اتنا ڈھیٹ تھا کہ پٹتا رہا مگر مجلس سے نہیں اٹھا، مولانا نے اس کو اتنا مارا کہ ہم سب کو رحم آگیا۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ مولانا تھانوی سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن صوفی نہیں ہو سکتے اس واقعے کو سنانے کے بعد مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میری دل کی آواز عجیب و غریب تھی اس لیے میں نے اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا اور اپنا احساس اپنے ہی تک محدود رکھا لیکن اب تم نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا واقعہ سنایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس احساس میں تنہا میں ہی نہیں ہوں بلکہ حضرت مفتی صاحب بھی اس میں شریک ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیائے کرام خلقِ خدا کے لیے سراپا رحم و کرم اور مجسم شفقت و محبت ہوتے تھے، ان کی خانقاہوں کا دروازہ ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا، ان کے یہاں آنے جانے والوں پر کسی قسم کی کوئی پکڑ دھکڑ یا دار و گیر کا ضابطہ نہیں تھا، اس کے برخلاف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مسترشدین کے لیے خاص خاص شرائط و ضوابط تھے اور جو کوئی شخص ان شرائط و ضوابط میں سے کسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتا تھا وہ موردِ عتاب بنتا تھا، اس فرق کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ پر لفظِ صوفی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت تھانوی نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ میں نہ صوفی ہوں نہ پیر بلکہ میں ایک معلّم اور مصلح ہوں جو شخص میرے پاس آتا ہے میں اس کے لیے اصلاح و تربیت کا کام کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا

© rasailojaraid.com